مودودی صاحب

ماخوذ از "اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم"

مصنفہ

مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی

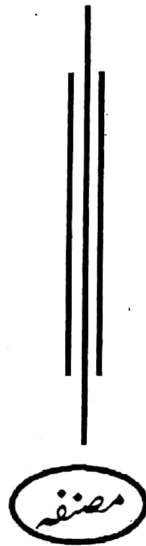
ناشر

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ

ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ، جمال پور، علی گڑھ

مودودی صاحب

ماخوذ از ''اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم''



مصنفہ

مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی

فہرست مندرجات

مولانا مودودی

بسم الله الرحمن الرحيم

مکتوب از دُبئی (امارات)

بنام

مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گرامی القدر جناب مولانا صاحب

گلدستۂ آداب و ہزار ہا تسلیمات!

میں، میرا ایک سگا بھائی، ایک خالہ زاد بھائی، پانچ سگے چچے اور بہت سے قریبی رشتہ دار، یہاں دُبئی اور شارجہ میں عرصہ سے مقیم ہیں۔ ہم سب لوگ سوائے ایک یا دو کے سختی کے ساتھ نماز کے پابند ہیں اور اپنی فراغت کے بیشتر لمحے مذہبی سوچ بچار اور بحث و مباحثہ پر ہی صرف کرتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر تعلیم یافتہ ہیں اور تھوڑی بہت مذہبی سوجھ بوجھ بھی رکھتے ہیں۔ تقریباً ہم سب کے پاس مختلف عقائد رکھنے والے علماء کرام کی تحریر کردہ کتب موجود ہیں۔ جن کا ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ رشتوں کے لحاظ سے جتنے ہم قریب ہیں اتنے ہی مذہبی اختلافات ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے عقائد پر بڑی سخت نکتہ چینی کرتے ہیں، جیسا کہ آجکل اپنے وطنِ عزیز میں ہو رہا ہے۔ ایک دوسرے کے پسندیدہ علمائے کرام پر تنقید کرتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر خامیاں بیان کرتے ہیں۔ ہم میں سے اکثریت سنی عقیدے والوں کی ہے، جو اپنے آپ کو سچا عاشقِ رسول کہلاتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو افضل تصور کرتے ہیں جیسا کہ آج کل پاکستان میں نورانی میاں صاحب اپنے آپ کو یعنی اپنی جماعت کو "سوادِ اعظم" کہتے ہیں۔ باقی چند جو دوسرے فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو عربوں کی دیکھا دیکھی صرف فرض نماز ہی ادا کرتے ہیں اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ چونکہ اسلام کی ابتداء یہاں ہی سے شروع ہوئی ہے، اس لئے یہ لوگ صحیح ہیں۔ ہم میں سے ایک گروپ ایسا بھی ہے جو مولانا مودودی صاحب کے علاوہ پاکستان میں کسی اور کو عالم ہی نہیں مانتا اور اس کا کہنا ہے کہ زیارتوں پر فاتحہ

پڑھنا حضرت غوث پاکؒ کی گیارہویں دینا اور ختم شریف پڑھوانا سب شرک ہے وغیرہ۔ بہرحال ہم سب لوگ جب کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں تو مجھے ثالث مقرر کیا جاتا ہے کیونکہ میں کسی بھی فرقہ کو غلط اور کسی عالم کو بُرا نہیں کہتا، اس لئے میرے باقی ساتھی میرا فیصلہ بخوشی تسلیم کر لیتے ہیں اور اس طرح ہماری بحث کافی حد تک کسی انجام کو پہنچتی ہے، مگر بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جو میں معلومات نہ ہونے کی وجہ سے حل نہیں کر پاتا۔ چونکہ ''جنگ'' میں میں آپ کا کالم بڑی پابندی سے اور توجہ سے پڑھتا ہوں اس لئے میں نے اپنے سب ساتھیوں سے مشورہ کر کے چند ضروری مسائل جن پر ہم لوگ آج تک متفق نہیں ہوئے ہیں، پوچھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

(۱) سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی اور وہابی فرقوں کے عقائد میں کیا فرق ہے، اِن میں اختلاف کیا ہیں، اِن میں سب سے افضل کون سا فرقہ ہے اور اُس میں کُل کتنے فرقے ہیں۔ نیز اماموں کے نام معہ صفات کے تحریر فرمائیں۔

(۲) نماز میں صرف فرض ادا کرنا کہاں تک درست ہے۔ یہاں کے ایک بہت بڑے خطیب صاحب سے جو مصری ہیں، میں نے یہ دریافت کیا کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں، آپ نماز جمعہ میں دو فرض ہی کیوں ادا کرتے ہیں جبکہ سنت اور نفل بھی ہیں۔ اُنہوں نے مجھے یہ جواب دیا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجرہ مسجدِ نبویؐ کے دروازے میں تھا۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر مسجد میں جاتے تھے اور دو فرض نمازِ جمعہ جماعت کے ساتھ پڑھا کر واپس حُجرے میں چلے جاتے تھے اور حجرے میں جا کر وہ کیا پڑھتے تھے، یہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اِس لئے میں سنتِ نبوی ادا کر رہا ہوں۔

آپ مہربانی کر کے اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالیں کہ آیا یہ خطیب صاحب درست فرماتے ہیں؟ اور اگر نہیں تو صحیح کیا ہے؟

(۳) زیارتوں پر فاتحہ خوانی کرنا، گیارہویں شریف دینا اور ختم شریف (یعنی کسی کی مغفرت کے لئے قرآن خوانی یا ذکرِ الٰہی کرانا) پڑھانا شرک ہے؟ قرآن وسنت کے حوالے دے کر واضح کریں۔

پہلے سوال کے بارے میں اتنا عرض ہے کہ اس کا جواب ہماری زندگیوں کو بدل سکتا ہے، کیونکہ ہم سب اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ جو کچھ بھی آپ قرآن وسنت کے مطابق لکھیں گے ہم اُس پر عمل کریں گے۔ اس لئے آپ مہربانی فرما کر ہمیں ایک صحیح راستہ دکھائیں۔

آپ کا دعا گو!

محمد کریم دبئی (یو، اے، ای)

جواب از

مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی

آپ اور آپ کے رفقاء کی دین سے دلچسپی لائقِ مبارکباد ہے، مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ اس دلچسپی کا رُخ بحث و مباحثہ سے ہٹا کر دین کے سیکھنے سکھانے، اُس کے علمی تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور آنحضرت ﷺ کے مبارک طریقوں کو اپنی اور دوسروں کی زندگی میں لانے کی طرف پھیرنا چاہئے۔

اور میرا یہ معروضہ دو وجوہات پر مبنی ہے، ایک یہ کہ بحث و مباحثہ سے انسان کی قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے۔ مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

مَاضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ اِلَّا اُوْتُوا الْجَدْلَ.

(ترجمہ: جو قوم ہدایت سے ہٹ کر گمراہ ہو جاتی ہے اُسے جھگڑا دے دیا جاتا ہے۔)

پس کسی قوم کا بحث و مباحثہ اور جھگڑوں میں اُلجھ کر رہ جانا اُس کے حق میں کسی طرح نیک فال قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بحث و مباحثہ میں عام طور سے سمجھنے سمجھانے کا جذبہ مغلوب ہو جاتا ہے اور اپنی اپنی بات منوانے کا جذبہ غالب آ جاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ آدمی علومِ شرعیہ سے پورے طور پر واقف نہ ہو، وہ حدودِ شرعیہ کی رعایت کرنے سے قاصر رہتا ہے، بسا اوقات ایسا ہوگا کہ ایک چیز غلط اور ناحق ہوگی مگر وہ اُسے حق ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ بسا اوقات اِس بحث و مباحثہ میں وہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی عیب جوئی کرے گا اور اُن پر زبانِ طعن دراز کر کے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرے گا۔ یہ ساری چیزیں مِل کر اُسے نہ صرف جذبۂ عمل سے

محروم کریں گی بلکہ اُس کی ذہنی ساخت میں قبولِ حق کی استعداد کم سے کم ہو جائے گی۔ اس لئے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ صاحبان میں سے جس کو جس عالم دین پر اعتماد ہو اور جس عالمِ دین کے بارے میں دیانتداری سے یہ سمجھتا ہو کہ یہ خداترس محقق عالمِ دین ہے اور محض رضائے الٰہی کی خاطر خدا تعالیٰ کا پیغام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات لوگوں تک پہنچاتا ہے، اُسکے ارشاد کے مطابق عمل کرتے ہوئے کام میں لگا رہے اور اِن بحث ومباحثوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ذکر وتسبیح، درود شریف، تلاوتِ قرآن مجید اور دیگر خیر کے کاموں سے اپنے اوقات کو معمور رکھے۔

آپ کے سوالات کا جواب ایک ضخیم کتاب کا موضوع ہے۔ یہ ناکارہ نہ اتنی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ اتنی فرصت ہے کہ اس کا حق ادا کرسکے۔ تاہم آپ کے حُکم کی تعمیل میں چند سطور لکھتا ہوں۔ اگر آپ اور آپ کے رفقاء کے لئے کسی درجہ میں مفید ہوں تو یہ اِس ناکارہ کی سعادت ہوگی ورنہ ''کالای بد بریش خاوند''۔

مولانا مودودی

منجملہ اور سوالوں کے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ کے رفقاء میں ایک گروہ مولانا مودودی کا مداح ہے اور یہ حضرات مولانا موصوف کے سوا کسی کو عالم ہی نہیں جانتے۔ اِس بارے میں بھی آپ میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں میں اپنی ناچیز رائے کا اظہار اپنے دو مضامین ''تنقید اور حقِ تنقید'' اور ''الامام المجاہد'' میں کرچکا ہوں، تاہم آپ کے حکم کی تعمیل میں یہاں بھی کچھ مختصراً عرض کرتا ہوں۔

مولانا مودودی کی تمام ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے مجھے موصوف سے بہت سی باتوں میں اختلاف ہے۔ جزئیات تو بے شمار ہیں مگر چند کلیات حسب ذیل ہیں:

اول: مولانا مودودی کے قلم کی کاٹ اور شوخی اُن کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے، مگر اِس ناکارہ کے نزدیک اُن کی سب سے بڑی خامی شاید یہی ہے۔ اُن کا قلم مؤمن وکافر

دونوں کے خلاف یکساں کاٹ کرتا ہے اور وہ کسی فرق و امتیاز کا روادار نہیں۔ جس طرح وہ ایک لادین سوشلسٹ کے خلاف چلتا ہے، ٹھیک اُسی طرح ایک مومن مخلص اور خادم دین کے خلاف بھی۔ وہ جس جرأت کے ساتھ اپنے کسی معاصر پر تنقید کرتے ہیں (جس کا انہیں کسی درجہ میں حق ہے) اُسی ''عبارت'' کے ساتھ وہ سلفِ صالحین کے کارناموں پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ وہ جب تہذیب جدید اور الحاد و زندقہ کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث گفتگو کر رہا ہے اور دوسرے ہی لمحے جب وہ اہلِ حق کے خلاف خامہ فرسائی کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے مسٹر پرویز یا غلام احمد قادیانی کا قلم چھین لیا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ نبوت و رسالت کا مقام کتنا نازک ہے ۔

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

کسی نبی علیہ السلام کے بارے میں کوئی ایسی تعبیر روا نہیں جو اُن کے مقام رفیع کے شایانِ شان نہ ہو۔ خود آنحضرت ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ پورا ذخیرۂ حدیث دیکھ جائیے، ایک بھی لفظ ایسا نہیں ملے گا جس میں کسی نبی کی شان میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کمی کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ لیکن مولانا مودودی کا قلم حریمِ نبوت تک پہنچ کر بھی ادب نا آشنا رہتا ہے اور وہ بڑی بے تکلفی سے فرماتے ہیں:

الف: ''موسیٰ علیہ السلام کی مثال اُس جلد باز فاتح کی سی ہے جو اپنے اقتدار کا استحکام کئے بغیر مارچ کرتا ہوا چلا جائے اور پیچھے جنگل کی آگ کی طرح مفتوحہ علاقہ میں بغاوت پھیل جائے''۔

(رسالۂ ترجمان القرآن ج ۲۹ عدد ۴ ص ۵)

ب: ''حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متاثر ہو کر اوریا سے طلاق کی درخواست کی تھی''۔

(تفہیمات حصہ دوم ص ۴۲ طبع دوم)

ج: "حضرت داؤد علیہ السلام کے فعل میں خواہش نفس کا کچھ دخل تھا۔ اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا"۔

(تفہیم القرآن ج ۴ سورہ ص صفحہ ۳۲۷ طبع اول اکتوبر ۱۹۶۶ء)

د: نوح علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اُس کو محض اِس لئے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہاری صلب سے پیدا ہوا ہے، محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے، تو وہ اپنے دل سے بے پرواہ ہو کر اُس طرزِ فکر کی طرف پلٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضا ہے"۔[1]

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۳۴۴ طبع سوم ۱۹۶۴ء)

ہ: سیدنا یوسف علیہ السلام کے ارشاد: اِجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ. (مجھے زمینِ مصر کے خزائن کا نگران مقرر کر دیجئے) کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یہ محض وزیر مالیات کے منصب کا مطالبہ نہیں تھا، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہ ڈکٹیٹر شپ کا مطالبہ تھا اور اس کے نتیجے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو جو پوزیشن حاصل ہوئی وہ قریب قریب وہی پوزیشن تھی جو اِس وقت اٹلی میں مسولینی کو حاصل ہے"۔

(تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۱۲۲ طبع پنجم ۱۹۷۰ء)

و: حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں

---

[1] پہلے ایڈیشن میں اس عبارت کا مختصر ذکر کیا گیا تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ اس کے بجائے اصل عبارت درج کی جائے۔

کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں۔ غالبًا اُنھوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا''۔

(تفہیم القرآن ج ۲ سورہ یونس، حاشیہ ص ۳۱۳-۳۱۲ طبع سوم ۱۹۶۴ء)

ممکن ہے مولانا مودودی اور اُن کے مداحوں کے نزدیک ''جلد باز فاتح'' - ''خواہشِ نفس کی بناء پر'' - ''حاکمانہ اقتدار کا نامناسب استعمال'' - ''بشری کمزوریوں سے مغلوب'' ''جذبہ جاہلیت کا شکار'' - ''فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں'' اور ''ڈکٹیٹر شپ'' جیسے الفاظ میں سوءِ ادب کا کوئی پہلو نہ پایا جاتا ہو، اس لئے وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایسے الفاظ کا استعمال صحیح سمجھتے ہوں - لیکن اس کا فیصلہ دو طرح ہو سکتا ہے، ایک یہ کہ اسی قسم کے الفاظ اگر خود مولانا موصوف کے حق میں استعمال کئے جائیں تو اُن کو یا اُن کے کسی مداح کو اُن سے ناگواری تو نہیں ہو گی؟ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ مولانا ڈکٹیٹر ہیں۔ اپنے دور کے ہٹلر ہیں۔ اور مسولینی ہیں۔ وہ خواہش نفس سے کام کرتے ہیں۔ جذبۂ جاہلیت سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ حاکمانہ اقتدار کا نامناسب استعمال کر جاتے ہیں اور اُنھوں نے اپنے فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہیاں کی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو میرا خیال ہے کہ مولانا کا کوئی عقیدت مند اِن ''الزامات'' کو برداشت نہیں کریگا۔ اگر یہ الفاظ مولانا مودودی کی ذات سیادت مآب کے شایانِ شان نہیں، بلکہ یہ مولانا کی تنقیص اور سوئے ادب ہے، تو انصاف فرمائیے کہ کیا ایسے الفاظ انبیاء کرام علیہم السلام کی شان میں زیبا اور شائستہ ہیں؟ اسی نوعیت کا ایک فقرہ اور سن لیجئے:

''یہاں اُس بشری کمزوری کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے جو آدم علیہ السلام سے ظہور میں آئی تھی۔ بس ایک فوری جذبے نے جو شیطانی تحریص کے زیر اثر اُبھر آیا تھا اُن پر ذہول طاری کر دیا اور ضبطِ نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقامِ بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے''——

(تفہیم القرآن ص ۱۳۳ ج ۲)

اس عبارت سے سیدنا آدم علیہ السلام کا اِسم گرامی حذف کر کے اُس کی جگہ اگر مولانا

مودودی کا نام لکھ دیا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ ان کے حلقہ میں کہرام مچ جائے گا اور پاکستان میں طوفان برپا ہو جائے گا۔ اس سے ثابت ہے کہ یہ فقرہ شائستہ نہیں بلکہ گستاخی اور سوءِ ادب ہے۔

اُسی کی ایک مثال اُمہات المومنین کے حق میں موصوف کا یہ فقرہ ہے:

''وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کچھ زیادہ جری ہو گئی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زبان درازی کرنے لگی تھیں''۔

(ہفت روزہ ایشیا لاہور مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۷۶ء)

مولانا موصوف نے یہ فقرہ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وعلیہن وسلم کے بارے میں فرمایا مگر میں اس کو مضاف سے زیادہ مضاف الیہ کے حق میں سوءِ ادب سمجھتا ہوں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ مولانا محترم کی اہلیہ محترمہ اُمہات المومنین سے بڑھ کر مہذب اور شائستہ نہیں، نہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مقدس ہیں۔ اب اگر ان کا کوئی عقیدت مند یہ کہہ ڈالے کہ مولانا کی اہلیہ مولانا کے سامنے زبان درازی کرتی ہیں تو مولانا اِس فقرے میں اپنی خفت اور ہتکِ عزت محسوس فرمائیں گے، پس جو فقرہ خود مولانا کے حق میں گستاخی تصور کیا جاتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ آنحضرت ﷺ اور امہات المونین کے حق میں سوءِ ادب کیوں نہیں؟

الغرض مولانا موصوف کے قلم سے انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں جو ادبی شہ پارے نکلے ہیں وہ سوءِ ادب میں داخل ہیں یا نہیں؟ اِس کا ایک معیار تو یہی ہے کہ اگر ایسے فقرے خود مولانا کے حق میں سوءِ ادب میں شمار ہو کر ان کے عقیدت مندوں کی دل آزاری کا موجب ہو سکتے ہیں تو ان کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں بھی سوءِ ادب ہیں۔ اور جو لوگ نبوت و رسالت پر ایمان رکھتے ہیں ان کی دل آزاری کا سبب ہیں۔

دوسرا معیار یہ ہو سکتا ہے کہ آیا اردو میں جب یہ فقرے استعمال کئے جائیں تو اہلِ زبان اُن کا کیا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اگر اِن دونوں معیاروں پر جانچنے کے بعد یہ طے ہو جائے کہ واقعی اِن کلمات میں سوءِ ادب ہے تو مولانا کو اِن پر اصرار نہیں کرنا چاہئے بلکہ اِن سے توبہ کرنی چاہئے، کیونکہ انبیاء کرام کے حق میں ادنیٰ سوءِ ادب بھی سلب ایمان کی علامت ہے۔

(۲) انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد انسانیت کا سب سے مقدس گروہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے۔ خصوصاً حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا منصب تو انبیاء کرام علیہم السلام اور امت کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس لئے ''تجدید واحیائے دین''۔ ''خلافت وملوکیت'' اور تفہیم القرآن وغیرہ میں خلیفۂ مظلوم سیدنا عثمان ذوالنورین، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عائشہ، حضرت معاویہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عمرو بن العاص، حضرت عتبہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں مولانا مودودی کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے اور جس کی صحت پر ان کو اصرار ہے، میں اِسے خالص رفض وتشیع سمجھتا ہوں اور مولانا کی ان تحریروں کے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ جس طرح بارگاہِ نبوت کے ادب ناشناس ہیں اُسی طرح مقامِ صحابیت کی رفعتوں سے بھی ناآشنا ہیں۔ کاش انہوں نے امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا ایک ہی فقرہ یاد رکھا ہوتا:

''ہیچ ولی بمرتبہ صحابی نرسد، اویس قرنی بآں رفعتِ شان کہ بشرفِ صحبتِ خیرالبشر۔ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہِ الصَّلوٰتُ وَالتَّسْلِیْمَاتُ نرسیدہ بمرتبۂ ادنیٰ صحابی نہ رسد۔ شخصے از عبداللہ بن المبارک رضی اللہ عنہ پُرسید۔ اَیُّھُمَا اَفْضَلُ مُعَاوِیَۃُ اَمْ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ؟

درجواب فرمود:

اَلْغُبَارُ الَّذِیْ دَخَلَ اَنْفَ فَرَسِ مُعَاوِیَۃَ. مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرٌ مِّنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِیْزِ کَذَا مَرَّۃً.

(مکتوبات دفتر اول مکتوب ۲۰۷)

ترجمہ: کوئی ولی کسی صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اویس قرنیؒ اپنی تمام تر بلندی شان کے باوجود چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شرفِ صحبت سے مشرف نہ ہو سکے اِس لئے کسی ادنیٰ صحابی کے مرتبہ کو بھی نہ پہنچ سکے۔ کسی شخص نے امام عبد اللہ بن مبارکؒ سے دریافت کیا کہ

حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبد العزیزؒ؟ فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار داخل ہوا وہ بھی عمر بن عبد العزیزؒ سے کئی گنا بہتر ہے''۔

یہاں یہ نکتہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت و رفاقت کا جو شرف حاصل ہوا ہے، پوری امت کے اعمالِ حسنہ مل کر بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ذرا تصور کیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی دو رکعتیں، جن میں صحابہ کرامؓ کو شرکت کی سعادت نصیب ہوئی، کیا پوری امت کی نمازیں مل کر بھی اُن کے دو رکعتوں کے ہم وزن ہو سکتی ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جو کسی صحابی نے ایک سیر جَو اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے انہیں شرف قبول عطا ہوا، بعد کی امت اگر پہاڑ برابر سونا بھی خیرات کر دے تو کیا یہ شرف اُسے حاصل ہو سکتا ہے؟ باقی تمام حسنات کو اِسی پر قیاس کر لیجئے۔

اِس شرفِ مصاحبت سے بڑھ کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ مدرسۂ نبوت کے ایسے طالب علم تھے جن کے معلم و ہادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جن کا نصابِ تعلیم مَلاءِ اعلیٰ میں مرتب ہوا تھا۔ جن کی تعلیم و تربیت کی نگرانی براہ راست وحی آسمانی کر رہی تھی، اور جن کا امتحان علام الغیوب نے لیا اور جب اُن کی تعلیم و تربیت کا ہر پہلو سے امتحان ہو چکا تو حق تعالیٰ شانہٗ نے انہیں ''رضی اللہ عنہم و رضواعنہ'' کی ڈگری عطا فرما کر آنے والی پوری انسانیت کی تعلیم و تربیت اور تلقین و ارشاد کا منصب ان کو تفویض کیا،'' اور ''کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ'' کی مسند اُن کے لئے آراستہ فرمائی۔ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد صرف صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت ایسی ہے، جن کی تعلیم و تربیت بھی وحی الٰہی کی نگرانی میں ہوئی اور اُن کو سندِ فضیلت بھی خود خداوند قدوس نے عطا فرمائی۔

مولانا مودودی کے عقیدت کیش یہ کہہ کر دل بہلا لیتے ہیں کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے

تاریخ کے حوالوں سے لکھا ہے اور یہ اُن کے قلم کا شاہکار ہے کہ اُنہوں نے منتشر ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک مربوط تاریخ مرتب کر ڈالی۔ میں اُن کی خدمت میں بہ ادب گزارش کروں گا کہ ان کا یہ بہلاوا بہ چند وجوہ غلط ہے۔

اول: مولانا کا یہ قلمی شاہکار نہ تاریخی صداقت ہے، نہ صحابہ کرامؓ کی زندگی کی صحیح تصویر ہے، بلکہ یہ ایک ''افسانہ'' ہے جس میں مولانا کے ذہنی تصورات ونظریات نے رنگ آمیزی کی ہے۔ آجکل ''افسانہ نگاری'' کا ذوق عام ہے۔ عام طبائع تاریخی صداقتوں میں اتنی دلچسپی نہیں لیتیں جتنی کہ رنگین افسانوں میں۔ اس لئے مولانا کی جولانیِ طبع نے صحابہ کرامؓ پر بھی ''خلافت وملوکیت'' کے نام سے ایک افسانہ لکھ دیا۔ جس کا حقائق کی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ آج اگر کوئی صحابیؓ دنیا میں موجود ہوتا تو شیخ سعدیؒ کی زبان میں، مولانا کے قلم سے یہ شکایت ضرور کرتا:

بخندید و گفت آں نہ شکلِ من است
ولیکن قلم درکفِ دشمن است

اگر مولانا کو صحابہ کرامؓ کا پاسِ ادب ملحوظ ہوتا تو قرآن کریم کے صریح اعلان ''رضی اللہ عنہم و رضواعنہ'' کے بعد وہ صحابہ کرامؓ کی بلند و بالا شخصیتوں کو افسانہ نگاری کا موضوع نہ بناتے۔

دوم: یورپ میں اسلام کی شخصیتوں کو مسخ کرنے اور ان کی سیرت و کردار کا حلیہ بگاڑنے کا کام بڑی خوبصورتی اور پرکاری سے ہو رہا ہے اور یہودی مستشرقین کی کھیپ اِس کام پر لگی ہوئی ہے۔ وہ بھی ٹھیک اِسی طرح بزعمِ خود تاریخ کے منتشر ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک فرضی تصویر تیار کرتے ہیں۔

اور دنیا کو باور کراتے ہیں کہ وہ پوری غیر جانبداری کے ساتھ اور کسی قسم کے تعصب کی آمیزش کے بغیر تاریخی حقائق دنیا کے سامنے لا رہے ہیں مگر اپنے اس لفظی ادعاء کے برعکس وہ جس طرح مسلّمہ تاریخی حقائق کو چھپاتے ہیں، جس طرح بالکل سیدھی بات کی اُلٹی تعبیر کرتے ہیں، جس طرح بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا کر اُسے پیش کرتے ہیں اور جس طرح اپنی بدفہمی یا

خوش فہمی سے وہ اس میں رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی کرتے ہیں، اس سے اُن کا تعصب اور اسلام سے اُن کی عداوت چھپائے نہیں چھپتی۔

ہم اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی ایسا شخص جو خدا اور رسولؐ پر ایمان رکھتا ہو، ٹھیک ٹھیک مستشرقین کے نقشِ پا کا تتبع کرے گا، لیکن بدقسمتی سے مولانا مودودی کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' کا بالکل یہی رنگ ڈھنگ ہے۔ پڑھنے والا مسکین یہ سمجھتا ہے کہ مولانا تاریخی حقائق جمع کر رہے ہیں، مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ تاریخ سے کیا لے رہے ہیں کیا چھوڑ رہے ہیں، اور کیا اپنی طرف سے اضافہ فرما رہے ہیں۔ الغرض جس طرح ہزار دل فریبیوں کے باوجود مستشرقین عداوتِ اسلام کے روگ کو چھپانے سے قاصر رہتے ہیں، اُسی طرح مولانا مودودی بھی اپنے اِس استشراقی شاہکار میں ہزار رکھ رکھاؤ کے باوصف، عداوتِ صحابہؓ کو چھپا نہیں سکتے۔ اب اگر مولانا محترم یا اُن کے عقیدتمندوں کی تاویلات صحیح ہیں تو مستشرقین کا کارنامہ اُن سے زیادہ صحیح کہلانے کا مستحق ہے اور اگر یہودی مستشرقین کا طرزِ عمل غلط ہے تو اُسی دلیل سے مولانا مودودی کا رویہ بھی غلط ہے۔

سوم: کہا جاتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ انسان ہی تھے، فرشتے نہیں تھے، وہ معصوم عن الخطاء نہیں تھے، اُن سے لغزشیں اور غلطیاں کیا، بڑے بڑے گناہ ہوئے ہیں، یہ کہاں کا دین وایمان ہے کہ اُن کی غلطی کو غلطی نہ کہا جائے۔

میں پہلے تو یہ عرض کروں گا کہ مولانا مودودی کو تو صحابۂ کرامؓ کی غلطیاں چھانٹنے کے لئے وقدی اور کلبی وغیرہ کا سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت پڑی ہے لیکن خدائے علام الغیوب صحابۂ کرامؓ کے ہر ظاہر و باطن سے باخبر تھے۔ اُن کے قلب کی ایک ایک کیفیت اور ذہن کے ایک ایک خیال سے واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ انسان ہیں، معصوم نہیں، اُنہیں یہ بھی علم تھا کہ آئندہ ان سے کیا کیا لغزشیں صادر ہوں گی۔ اِن تمام امور کا علم محیط رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اُن کو ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ'' کا اعزاز عطا فرمایا تو ان کی غلطیاں بھی۔ ع

ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر است

کا مصداق ہیں۔ اِس کے بعد مولانا مودودی کو اِن اکابر کی خردہ گیری وعیب چینی کا کیا حق پہنچتا ہے؟ کیا یہ خدا تعالیٰ سے صریح مقابلہ نہیں کہ وہ تو اِن تمام لغزشوں کے باوجود صحابۂ کرامؓ سے اپنی رضائے دائمی کا اعلان فرما رہے ہیں مگر مولانا مودودی اِن اکابر سے راضی نامہ کرنے پر تیار نہیں؟

دوسری گزارش میں یہ کروں گا کہ چلئے! فرض کر لیجئے کہ صحابۂ کرامؓ سے غلطیاں ہوئی ہوں گی مگر سوال یہ ہے کہ آپ چودہ سو سال بعد اُن اکابر کے جرائم کی دستاویز مرتب کر کے اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی میں اضافہ کے سوا اور کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ اکابر دنیا میں موجود ہوتے تب تو آپ اُنہیں اُن کی غلطیوں کا نوٹس دے ڈالتے، مگر جو قوم تیرہ سو سال پہلے گزر چکی ہے اُس کے عیوب ونقائص کو غلط سلط حوالوں سے چن چن کر جمع کرنا اور اِس ساری غلاظت کا ڈھیر قوم کے سامنے لگا دینا، اِس کا مقصد اِس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے دل میں صحابۂ کرامؓ سے جو حُسنِ عقیدت ہے اُسے مٹا دیا جائے اور اُس کی جگہ قلوب پر صحابہؓ سے بغض و نفرت کے نقوش ابھارے جائیں؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ کس عقل و دانش اور دین وایمان کا تقاضہ ہے؟

چہارم: خلافت وملوکیت میں مولانا مودودی نے جس نازک موضوع پر قلم اٹھایا ہے اُسے ہماری عقائد وکلام کی کتابوں میں ''مشاجرات صحابہؓ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور یہ باب، ایمان کا ایسا پُل صراط ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے، اس لئے سلف صالحین نے ہمیشہ یہاں پاس ادب ملحوظ رکھنے اور زبان وقلم کو لگام دینے کی وصیت کی ہے، کیونکہ بعد کی نسلیں ہی نہیں بلکہ صحابۂ کرامؓ کے زمانے سے سطح بین لوگ بھی اِسی وادی پُر خار میں دامن ایمان تار تار کر چکے ہیں۔ اکابرِ امت ہمیشہ ان بد دینوں کے پھیلائے ہوئے کانٹوں کو صاف کرتے آئے ہیں لیکن مولانا مودودی سلفِ صالحین کو ''وکیلِ صفائی'' کہہ کر دھتکار دیتے ہیں۔ اُن کے ارشاد کو ''خواہ مخواہ کی سخن سازیاں'' اور ''غیر معقول تاویلات'' قرار دے کر رد کرتے ہیں اور اُن تمام کانٹوں کو، جن میں اُلجھ کر روافض اور خوارج نے اپنا دین وایمان غارت کیا تھا، سمیٹ کر نئی نسل کے سامنے لا ڈالتے ہیں۔ انصاف فرمائیے کہ اِسے اسلام کی خدمت کہا جائے یا اِسے

رافضیت وخارجیت میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کا نام دیا جائے؟ اور مولانا مودودی اور اُن کے معتقدین اس کارنامے کے بعد کیا یہ توقع رکھتے ہیں کہ اُن کا حشر اہلسنت ہی میں ہوگا، رافضیوں اور خارجیوں میں نہیں ہوگا؟ میں ہزار سوچتا ہوں مگر اِس معمہ کو حل نہیں کر پاتا کہ مولانا موصوف نے یہ کتاب نئی نسل کی راہنمائی کے لئے لکھی ہے، یا انہیں صراطِ مستقیم سے برگشتہ کرنے کے لئے؟

پنجم: سب سے بڑھ کر تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ تیرہ چودہ سو سال کے واقعہ کی ''تحقیقات'' کے لئے مولانا ''عدالتِ شرعیہ'' قائم کرتے ہیں جس کے صدر نشین وہ خود بنتے ہیں۔ اکابر صحابہ کو اِس عدالت میں ملزم کی حیثیت سے لایا جاتا ہے، واقدی وکلبی سے شہادتیں لی جاتی ہیں۔ صدرِ عدالت خود ہی جج بھی ہے اور خود ہی وکیل استغاثہ بھی، اگر سلفِ صالحین اکابر صحابہؓ کی صفائی میں کچھ عرض معروض کرتے ہیں تو اسے وکیلِ صفائی کی خواہ مخواہ سخن سازی اور غیر معقول تاویلات کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے — اِس طرح یکطرفہ کارروائی کے بعد مولانا اپنی تحقیقاتی رپورٹ مرتب کرتے ہیں اور اُسے ''خلافت وملوکیت'' کے نام سے قوم کی بارگاہ میں پیش کر دیتے ہیں۔

اس امر سے قطع نظر کہ اِن ''تحقیقات'' میں دیانت کے تقاضوں کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے، اِس سے قطعِ نظر کہ شہادتوں کی جرح ونقد میں کہاں تک احتیاط برتی گئی ہے اور اس سے بھی قطعِ نظر کہ فاضل جج نے خود اپنے ذہنی تصورات کو واقعات کا رنگ دینے میں کس حد تک سلامتیٔ فکر کا مظاہرہ کیا ہے، مجھے بہ ادب یہ عرض کرنا ہے کہ آیا مولانا کی اس خودساختہ عدالت کو اِس کیس کی سماعت کا حق حاصل ہے؟ کیا یہ مقدمہ جس کی تیرہ سو سال بعد مولانا تحقیقاتی رپورٹ مرتب کرنے بیٹھے ہیں اُن کے دائرہ اختیار میں آتا ہے؟ کیا اُن کی یہ حیثیت ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں کا مقدمہ نمٹانے بیٹھ جائیں؟

مجھے معلوم نہیں کہ مولانا کے مداحوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے مگر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ صحابۂ کرامؓ کے مقدمہ کی سماعت اُن سے اوپر کی عدالت ہی کر سکتی ہے، اور وہ یا تو حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم ہیں یا خود احکم الحاکمین، اِن کے سوا ایک مولانا مودودی نہیں، امت کا کوئی فرد بھی اس کا مجاز نہیں کہ وہ قدوسیوں کے اِس گروہ کے معاملہ میں مداخلت کرے۔ صحابۂ کرامؓ

کے باہمی معاملات میں آج کے کسی بڑے سے بڑے شخص کا لب کشائی کرنا اُس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ کوئی بھنگی بازار میں عدالت جما کر بیٹھ جائے اور وہ اکابرِ مملکت کے بارے میں اپنے بے لاگ فیصلے لوگوں کو سنانے لگے۔ایسے موقعوں پر ہی کہا گیا ہے:

ایاز! قدرِ خویش بشناس

ششم: یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ حضرات صحابۂ کرام علیہم الرضوان کو حق تعالیٰ شانہٗ نے اُمت کے مرشد و مربی اور محبوب و متبوع کا منصب عطا فرمایا ہے، قرآن و حدیث میں اُن کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے اور اُن سے عقیدت و محبت رکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اور اُن کی برائی و عیب جوئی کو ناجائز و حرام بلکہ موجبِ لعنت فرمایا گیا ہے۔خود مولانا مودودی کو اعتراف ہے کہ

''صحابۂ کرام کو بُرا بھلا کہنے والا میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں بلکہ اس کا ایمان بھی مشتبہ ہے مَنْ اَبْغَضَھُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَھُمْ. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے اُن سے بغض رکھا اُس نے مجھ سے بغض رکھنے کی بنا پر ان سے بغض رکھا۔(ترجمان القرآن اگست ۱۹۶۱ء)

جن لوگوں نے مولانا کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' پڑھی ہے وہ شہادت دیں گے کہ اس میں صحابہ کرامؓ کو صاف صاف بُرا بھلا کہا گیا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے مصنف کا بغض ونفرت بالکل عیاں ہے۔مثلاً ''قانون کی بالاتری کا خاتمہ'' کے زیرِ عنوان مولانا مودودی لکھتے ہیں:

الف: ''ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور اُن کے حکم سے اُن کے گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجدِ نبوی میں منبرِ رسول پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور اُن کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔کسی کے مرنے کے بعد اُس کو گالیاں دینا، شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا، اور

خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلود کرنا تو دین واخلاق کے لحاظ
سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔'' (خلافت وملوکیت ص ۱۴۷)

ب۔ ''مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ
وسنتِ رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب وسنت کی
رو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیے
اور باقی چار حصے اُس فوج میں تقسیم کئے جانے چاہئیں جو لڑائی میں شریک
ہوئی ہو، لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا
اُن کے لئے الگ نکال لیا جائے پھر باقی مال شرعی قاعدے سے تقسیم
کیا جائے''۔ (حوالہ بالا)

ج۔ ''زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے اُن افعال میں سے
ہے جن میں اُنہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم
قاعدے کی خلاف ورزی کی۔ یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا''۔ (ص ۱۷۵)

د۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور اُنکی
زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف صاف
انکار کر دیا''۔ (ایضاً)

مولانا مودودی کی ان عبارتوں میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے کے لئے جو کچھ لکھا ہے، وہ قطعاً خلافِ واقعہ ہے اور علمائے کرام اِس کی حقیقت واضح کر چکے ہیں، مجھے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جو لوگ مولانا مودودی کی بات پر ایمان لا کر مولانا کی اس افسانہ طرازی کو حقیقت سمجھیں گے وہ حضرت معاویہؓ اور اُس دور کے تمام اکابر صحابہ و تابعین سے محبت رکھیں گے یا بغض؟ اُن کی اقتداء پر فخر کریں گے یا ان پر لعنت بھیجیں گے؟ اور خود مولانا موصوف نے اِن عبارتوں میں حضرت معاویہ ؓ کو برا بھلا نہیں کہا تو کیا ان کی قصیدہ خوانی فرمائی ہے؟ اگر میں یہ گزارش کروں کہ خود انہی کی نقل کی ہوئی حدیث کے مطابق ''وہ فاسق ہی نہیں بلکہ ان کا

ایمان بھی مشتبہ ہے‘‘ تو کیا یہ گستاخی بیجا ہوگی؟ مولانا مودودی سے مجھے توقع نہیں کہ وہ اپنی غلطی پر کبھی نادم ہوں گے مگر میں یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اِس کا انجام نہایت ہی خطرناک ہے۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ شیعوں کے ایک عالم محقق طوسی نے اپنی کتاب ’’تجرید العقائد‘‘ کے آخر میں صحابہ کرامؓ پر تبرا کیا تھا۔ مرنے لگا تو غلام احمد قادیانی کی طرح منہ کے راستے سے نجاست نکل رہی تھی[1] اُس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا، ایں چیست؟ (یہ کیا ہے) کوئی خوش عقیدہ عالم وہاں موجود تھے، بولے:

’’ایں ہماں ریداست کہ درآخرِ تجرید خوردی

ترجمہ: یہ وہی گندگی ہے جو تو نے تجرید کے آخر میں کھائی تھی۔

حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں ان اکابر کے سوءادب سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

(۳) جب اسلام کا سب سے مقدس ترین گروہ صحابہ کرام علیہم الرضوان بھی مولانا مودودی کی نگہ بلند میں نہ جچا ہو تو بعد کے سلفِ صالحین، اکابرِ امت، فقہاء محدثین اور علماء وصوفیاء کی اُن کی بارگاہ میں کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ چنانچہ موصوف نے اکابرِ امت پر تنقید کرنے کو اپنے نیازمندوں کے لئے جزوِ ایمان ٹھہرادیا۔ ’’دستورِ جماعت اسلامی‘‘ کی دفعہ ۳ میں کلمہ طیب کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ’’ذہنی غلامی‘‘ میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بتائے ہوئے اِسی معیار کامل پر جانچے اور پرکھے، اور جو اِس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہے اُس کو اسی درجہ پر رکھے‘‘۔ (ص ۲۴ طبع سوم ۱۹۶۲ء)

’’ذہنی غلامی‘‘ کی اصطلاح مولانا نے ’’تقلید‘‘ کے معنی میں استعمال فرمائی ہے، یعنی کسی فرد یا گروہ کے علم وعمل اور دیانت وتقویٰ پر اِس قدر وثوق واعتماد کر لینا کہ اُس کی ہر بات پر

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی کی موت وبائی ہیضہ سے ہوئی۔ دست و قے کی صورت میں دونوں راستوں سے نجاست خارج ہو رہی تھی۔

طلب دلیل کی حاجت نہ رہے، یہ مولانا کے نزدیک ''ذہنی غلامی'' ہے، گویا اُن کی جماعت کا کوئی فرد اگر رسولِ خدا کے سوا کسی جماعت، گروہ یا فرد پر اعتماد کر بیٹھا، اُس کے طریقہ کو حق سمجھ لیا اور اُس پر ''تنقید'' کا فریضہ ادا نہ کیا تو مولانا کے نزدیک خدانخواستہ وہ اسلام ہی سے خارج ہے۔ مولانا کے نزدیک اسلام میں داخل ہونے کی شرط اولین یہ ہے کہ ہر شخص خدا کے بتائے ہوئے معیارِ کامل کو سامنے رکھ کر پوری امتِ اسلامیہ پر تنقید کرے۔ پھر جب مولانا نے یہ فریضہ ادا کرنے کے لئے امتِ اسلامیہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو اُنہیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ یہ امت صدرِ اول سے لے کر آج تک بانجھ چلی آتی ہے اور اس میں ایک بھی ''مردِ کامل'' پیدا نہیں ہوا — اپنی مشہور کتاب ''تجدید و احیائے دین'' میں ''خلافتِ راشدہ'' کے زیرِ عنوان تحریر فرماتے ہیں:

> ''خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارا کام ۲۳ سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا، آپ کے بعد ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما، دو ایسے کامل ''لیڈر'' اسلام کو میسر آئے جنہوں نے اسی جامعیت کے ساتھ آپ کے کام کو جاری رکھا۔ پھر زمامِ قیادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتداءً چند سال تک وہ پورا نقشہ بدستور جما رہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا''۔ (ص ۳۶ طبع ششم ۱۹۵۵ء)
>
> ''مگر ایک طرف حکومتِ اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمان، جن پر اِس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا، اُن تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو اُن کے جلیل القدر پیش رووں کو عطا ہوئی تھیں، اِس لئے اُن کے زمانۂ خلافت میں جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی میں گھس آنے کا موقعہ مل گیا۔ حضرت عثمان نے اپنا سر دے کر اِس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رُکا، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر ان

کی جان کی قربانی بھی اس انقلابِ معکوس کو نہ روک سکی۔ آخر خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور ختم ہو گیا، ملک عضوض نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اُس کے ہاتھ میں تھی اور اسلام زورِ حکومت سے محروم ہونے کے بعد اُس کے اثر ونفوذ کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ ''مسلمان'' بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا، مگر وہاں تو آگے آگے توحید و رسالت کا اقرار، صوم وصلوٰۃ پر عمل، قرآن وحدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی''۔ (ص ۳۶-۳۷)

یہ نقشہ مولانا موصوف، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بیس پچیس سال بعد کا کھینچ رہے ہیں، جب بقول ان کے ''جاہلیت'' نے اسلام کا نقاب اوڑھ کر اقتدار کی کنجیاں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور عالمِ اسلام میں اسلام کے بجائے جاہلیت کا سکہ چلنے لگا تو اسلام اور مسلمانوں پر کیا گزری؟ اس کی داستان مولانا ہمیں یوں سناتے ہیں:

''جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی راہنمائی پر ''مسلمان'' کا جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں ''مسلمان'' کا معلم ہونا جاہلیت کی سجادہ پر ''مسلمان'' کا مرشد بن کر بیٹھنا، وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں

اوران کے اثرات روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے۔

(۱) جاہلیتِ خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا، نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا۔ بادشاہوں کو الٰہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی اس لئے ''السُّلطانُ ظِلُّ اللہِ'' کا بہانہ تلاش کیا گیا اور اِس بہانے سے وہی مطاعِ مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جو الٰہ کی ہوتی ہے۔

(۲) جاہلیتِ مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستہ سے ہٹا کر اُن کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہوسکتی تھی، باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے ''مسلمانوں'' میں رواج نہ پایا ہو۔

(۵) جاہلیتِ راہبانہ نے علماء مشائخ، زہاد و پاکباز لوگوں پر حملہ کیا، اور اُن میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کر دیں جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔ اِس جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ، راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر پہلو میں مایوسانہ نقطۂ نظر مسلم سوسائٹی میں پھیلا اور اُس نے نہ صرف ادبیات اور علوم کو متاثر کیا بلکہ فی الواقع سوسائٹی کے اچھے عناصر کو ''مارفیا کا انجکشن'' دے کر مست کر دیا، بادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم وفنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا''۔ (ص ۳۸-۴۱)

مولانا کی اس ساری داستان سرائی کو ایک بار پھر پڑھئے اور دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ جب صحابہ وتابعین کی موجودگی میں جاہلیت نے اسلام کو پچھاڑ دیا اور اقتدار کی کنجیاں تب سے اب تک اسلام کو واپس نہیں مل سکیں تو امتِ مسلمہ سے زیادہ ناکام کوئی امت ہوسکتی ہے؟ آج کے دہریے، کمیونسٹ اور لادین عناصر جو اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، کیا وہ ہی سب کچھ خود مولانا

مودودی نہیں فرمارہے؟

اِس کے بعد مولانا ''مجددین کی ضرورت'' کے زیرعنوان ہمیں بتاتے ہیں کہ:

''اِنہی تینوں اقسام کی جاہلیت کے ہجوم سے اسلام کونکالنا اور پھر سے چمکا دینا، وہ کام تھا جس کے لئے دین کو مجددین کی ضرورت پیش آئی''۔(ص ۴۱)

اور پھر صفحہ ۴۸ سے ۵۰ تک ''کارِتجدید'' کے عنوان سے مولانا ان شعبوں کی تفصیل بتاتے ہیں جن میں تجدید کا کام ہونا چاہیئے، وہ انہیں کے الفاظ میں حسب ذیل نو شعبے ہیں (۱) اپنے ماحول کی صحیح تشخیص (۲) اصلاح کی تجویز (۳) خود اپنے حدود کا تعین (۴) ذہنی انقلاب (۵) عملی اصلاح کی کوشش (۶) اجتہاد فی الدین (۷) دفاعی جدوجہد (۸) احیائے نظامِ اسلامی (۹) عالمگیر انقلاب کی کوشش۔

ان نو شعبوں کی تشریح کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ:

''ان شعبوں پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تین مدات تو ایسی ہیں جو ہر اس شخص کے لئے ناگزیر ہیں جو تجدید کی خدمت انجام دے، لیکن باقی چھ مدیں ایسی ہیں جن کا جامع ہونا مجدد ہونے کے لئے شرط نہیں، بلکہ جس نے ایک یا دو یا تین یا چار شعبوں میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو وہ بھی مجدد قرار دیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس قسم کا مجدد جزوی ہوگا کامل مجدد نہ ہوگا۔ کامل مجدد صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جو اِن تمام شعبوں میں پورا کام انجام دے کر وراثتِ نبوت کا حق ادا کردے''۔(ص ۵۰)

سوال یہ ہے کہ اسلام کی جاہلیت کے نرغے سے نکالنے کے لئے اس امت میں کوئی کامل مجدد بھی ہوا یا نہیں؟ اور کسی بندۂ خدا کو بھی ''وراثتِ نبوت کا حق'' ادا کرنے کی توفیق ملی یا نہیں؟ اس کا جواب مولانا مودودی نفی میں دیتے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ:

''تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی کامل مجدد پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ اُن کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے اُن میں سے ہر ایک

> نے کسی خاص شعبے میں یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مقابلہ کرتی ہے اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا ''لیڈر'' پیدا ہو، خواہ اِس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام ''الامام المہدی'' ہوگا۔ (ص ۵۱)

یہ ہے وہ خلاصہ جو میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ مولانا مودودی کی تنقیدی نظر میں آج تک کوئی مرد کامل اِس امت میں پیدا نہیں ہوا، ظاہر ہے کہ آپ کسی شخص پر اعتماد تو جبھی کریں گے جب کہ اُسے کسی درجے میں بھی ''معیاری آدمی'' سمجھیں گے، جب مولانا کے نزدیک امت میں کوئی معیاری آدمی ہوا ہی نہیں تو وہ پوری امت کو تنقید سے بالاتر کیوں سمجھیں گے اور اُس پر اعتماد کیوں کریں گے؟

البتہ مولانا مودودی اور اُن کے رفقاء کی ہمت لائق داد ہے۔ مولانا ہمیں بتاتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ کے ابتدائی دور سے لے کر اسلام پر جاہلیت کا قبضہ چلا آتا ہے۔ بادشاہ اللہ بنے بیٹھے ہیں۔ عوام مشرکانہ جاہلیت کے دام میں گرفتار ہیں۔ علماء و مشائخ لوگوں کو ''مارفیا'' کے انجکشن دے رہے ہیں۔ اسلام جاہلیت کے چنگل میں پھڑ پھڑا رہا ہے مگر کوئی صحابی، کوئی تابعی، کوئی امام، کوئی محدث، کوئی مجدد ایسا نہیں اُٹھتا جو آگے بڑھ کر جاہلیت سے اقتدار کی کنجیاں چھین لے۔ گویا چودہ سو سال کی پوری امت، وراثتِ نبوت کا حق ادا کرنے سے محروم ہے، وہ یا تو خود جاہلیت کے گماشتہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے یا جاہلیت کے فریب اور دھوکے میں مبتلا ہے۔ اس امت میں مجدد بھی آتے ہیں تو بس جزوی قسم کے کام کر کے چلے جاتے ہیں، اُن میں کرنے کا اصل کام ایک بھی نہیں کرتا۔ بلکہ مولانا کے بقول پوری امت ''وراثتِ نبوت کا حق ادا کرنے'' سے محروم رہتی ہے۔ بتائیے! اِس سے بڑھ کر امت کے اپاہج اور بانجھ ہونے کی کوئی اور تعبیر ہو سکتی ہے؟ مولانا نے اس امت کی جو تصویر کھینچی ہے، میں دوسروں کی بات نہیں کرتا کم از کم اپنے اسلاف کے بارے میں مولانا کا مرتب کردہ نقشہ دیکھ کر شرم کے مارے سر جھک جاتا ہے، میں مولانا

مودودی کے رفقاء کی حوصلہ مندی کی داد دیتا ہوں کہ اِن ساری باتوں کے باوجود اِس اپاہج امت میں اپنے آپ کو شمار کرتے ہوئے اُنہیں ذرا جھجک اور شرم محسوس نہیں ہوتی۔

مولانا نے امتِ مرحومہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن پر مفصل بحث کا موقع نہیں۔ مختصراً اتنا عرض کروں گا کہ اگر اس کہانی کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ امت ''خیرِ امت'' نہیں رہتی بلکہ نعوذ باللہ شر امت بن جاتی ہے۔ اس لئے مولانا کی یہ ساری کہانی ایک تخیلاتی کہانی ہے، جو رافضی طرزِ فکر سے مستعار لی گئی ہے۔ اسلافِ امت کو بدنام کرنے اور نئی نسل کا ذہنی رابطہ اُن سے کاٹنے کے سوا اِس کا کوئی مقصد اور کوئی نتیجہ نہیں۔ جو شخص مولانا مودودی کے تصورات و افکار پر ایمان بالغیب رکھتا ہو وہ اُسے صحیح سمجھتا ہے تو سمجھا کرے لیکن جو شخص اسلام کی ابدیت، قرآن وسنت کی نصوصِ قطعیہ اور نبوت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مولانا کی اِس ژولیدہ فکری پر ایمان نہیں لاسکتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ گزشتہ صدیوں کی پوری امت فرشتہ صفت رہی اور کسی فرد سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی، نہ میں کجکلاہ بادشاہوں، کجرو عوام یا کج طینت علمائے سوء اور دوکاندار صوفیوں کی وکالت کرنا چاہتا ہوں، میں جس چیز کے خلاف احتجاج کر رہا ہوں، وہ مولانا کی یہ منطق ہے کہ یہ امت مجموعی طور پر اسلام کے بجائے جاہلیت کی نمائندہ بن گئی تھی، اسلام اس کے نزدیک محض ثانوی چیز بن گیا تھا، اور چند گنے چنے افراد ہی اپنی انفرادی زندگی میں اسلامی تعلیمات کے حامل تھے..... مولانا کے بقول:

> ''جو مقصد اصلی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا تھا اُس کے لئے یہ دونوں چیزیں ناکافی تھیں، نہ یہ بات کافی تھی کہ اقتدار جاہلیت کے ہاتھ میں ہو اور اسلام محض ایک ثانوی قوت کی حیثیت سے کام کرے، اور نہ یہی بات کافی تھی کہ چند افراد یہاں اور چند وہاں محدود انفرادی زندگیوں میں اسلام کے حامل رہیں، اور وسیع تر اجتماعی زندگی میں اسلام اور جاہلیت کے مختلف النوع مرکبات پھیلے رہیں۔ لہٰذا دین کو ہر دور میں ایسے طاقتور

اشخاص، گروہوں اور اداروں کی ضرورت تھی اور ہے، جو زندگی کی بگڑی ہوئی رفتار کو بدل کر پھر سے اسلام کی طرف پھیر دیں" (تجدید و احیائے دین ص ۴۲)

مولانا صراحت کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربع صدی بعد ہی پوری کی پوری امت انبیاء کرام کی بعثت کے اصلی مقصد کو فراموش کر بیٹھی تھی، اور یہ ایک ایسا جرم ہے جو پوری امت اور اس کے تمام اکابر کو بدترین مجرم کی حیثیت دیتا ہے۔ اِس لئے دو باتوں میں سے ایک بہر حال غلط ہے، یا تو مولانا مودودی، انبیاء کرام علیہم السلام کے اصل مشن کو نہیں سمجھے، یا اُنہوں نے اس امت کے بارے میں صحتِ فکر سے کام نہیں لیا، اور نئی نسل کے سامنے صحابہ کرام، تابعینؒ عظام اور اکابر امت کو مجرم کی حیثیت سے پیش کر کے نہ صرف امت مرحومہ سے بلکہ خود اپنی سلامتی فکر سے بھی بے انصافی کی ہے۔ نئی نسل کو اسلافِ امت سے بدظن کرنا کوئی ایسا بڑا کارنامہ نہیں، جس کے لئے ہمیں مولانا مودودی کے قلم کی احتیاج ہوتی۔ یہ کام شیعہ، روافض وغیرہ تو شروع ہی سے کرتے آ رہے تھے۔ جدید دور میں قادیانی، چکڑالوی، پرویزی، کمیونسٹ اور سارے ملاحدہ یہی کچھ کر رہے ہیں۔ جس کو کسی نئے فکر کی بنیاد ڈالنی ہو وہ سب سے پہلے اسلافِ امت ہی سے ٹکراتا ہے، بدقسمتی سے یہی خدمت مولانا مودودی کے تیز رو قلم نے انجام دی ہے۔

(۴) پوری امت کو اپاہج اور نا کارہ باور کرانے کے بعد امت کے جلیل القدر قائدین کے کارناموں میں کیڑے نکالنا بھی ضروری تھا۔ تاکہ نئی نسل کے دل و دماغ میں کسی بزرگ کی عقیدت و احترام کا داغ دھبہ باقی نہ رہے۔ اور خدانخواستہ مولانا کا کوئی نیاز مند اسلافِ امت میں سے کسی کی "ذہنی غلامی" کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ مولانا نے یہ فریضہ بھی بڑی بلند آہنگی سے انجام دیا۔ امت اسلامیہ میں چند ہی افراد ایسے تھے جن کا تجدیدی کارنامہ مولانا کے نزدیک لائق ذکر تھا۔ یعنی خلیفہؒ راشد عمر بن عبدالعزیز، ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ، امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ، امیر المومنین سید احمد بریلویؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ قدس اللہ اسرارھم۔

سیدعمر بن العزیزؒ کے بارے میں تو مولانا کا ارشاد گزر چکا ہے کہ ''قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اِس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ائمہ اربعہ'' کا کارنامہ اُن کے نزدیک صرف یہ ہے کہ اُنہوں نے اُصولِ دین سے اسلام کے قوانین کو تفصیلی شکل میں مرتب کر دیا لیکن مولانا کے بقول انبیاء علیہم السلام کے مشن کے لئے انہوں نے کچھ نہیں کیا، گویا کرنے کا جو اصلی کام تھا اُس کو اُنہوں نے ہاتھ نہیں لگایا۔

امام غزالیؒ کے بارے میں ارشاد ہے کہ:

''امام غزالیؒ کے تجدیدی کام میں علمی وفکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک قسم اُن نقائص کی جو حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے کام میں پیدا ہوئے۔ دوسری قسم اُن نقائص کی جو اُن کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے اور تیسری قسم اُن نقائص کی جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے''۔ (تجدید واحیائے دین ص ۷۸)

امام غزالیؒ کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا نام آتا ہے۔ اُن کے تجدیدی کام کا اختتام یہاں ہوتا ہے:

''تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی ایسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظامِ حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضہ سے نکل کر اسلام کے ہاتھ میں آ جاتیں''۔ (ص ۸٦)

ابن تیمیہؒ کے بعد مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، سید احمد شہیدؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کے تجدیدی کارناموں کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

''پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وقت سے شاہ صاحب اور اُن کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا، اور

نادانستہ اُن کو پھر وہی غذا دیدی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے فی نفسہٖ اُس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو اِن حضرات نے پیش کیا، وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصل تصوف ہے اور اُس کی نوعیت احسان سے کچھ مختلف نہیں، لیکن جس چیز کو میں لائقِ پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز واشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال اور متصوفانہ طریقے سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے....'' (ص ۱۳۱)

مولانا کو تصوف کے نام، اس کی اصطلاحات اور اس کے طور وطریق سے چڑ ہے۔ وہ اِن اکابر کے تصوف کو ''غیر اسلامی'' کہنے کی جرات تو کر نہیں سکتے، مگر ان کے تصوف کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پس جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اُس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جب وہ مریض کے لئے نقصان دہ ہو، اُسی طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اِسی بناء پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اِس کے لباس میں مسلمانوں کو ''افیون'' کا چسکا لگایا گیا ہے اور اِس کے قریب جاتے ہی اُن مزمن مریضوں کو پھر وہی ''چنیا بیگم'' یاد آ جاتی ہے جو صدیوں تک اُن کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہے''۔ (ص ۱۳۲)

''مسلمانوں کے اس مرض سے نہ حضرت مجدد ناواقف تھے، نہ شاہ صاحب، دونوں کے کلام میں اس پر تنقید موجود ہے، مگر غالباً اس مرض کی شدت کا انہیں اندازہ نہ تھا یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے اِن بیماروں کو پھر وہی غذا دے دی جو اِس مرض میں مہلک ثابت ہو چکی تھی، اور اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا حلقہ پھر اُسی پرانے مرض سے متاثر ہوتا چلا گیا''۔ (ص ۱۳۳)

''اگر چہ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اِس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی جو ابن تیمیہؒ کی تھی، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود تھا، جس کا کچھ اثر شاہ اسماعیل شہید کی تحریروں میں بھی باقی رہا اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی سید صاحب کی تحریک میں چل رہا تھا، اِس لئے ''مرض صوفیت'' کے جراثیم سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی۔'' (ص ۱۳۴)

یہ امت محمدیہ کے وہ اکابر ہیں جن کو پوری امت کے چیدہ اور منتخب افراد کی حیثیت میں مولانا نے پیش کیا ہے۔ اِن کے بارے میں مولانا نے جو تنقید کی ہے، کوئی احمق ہی ہوگا جو مولانا کی تنقید کو حق بجانب سمجھنے کے بعد اِن اکابر پر اعتماد کرے اور اِن کی روش کو لائق تقلید سمجھے۔ مولانا نے ''تجدید'' کے جن نو (۹) شعبوں کا تذکرہ کیا ہے اسے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھ لیجئے، اُن میں سب سے پہلے نمبر پر مولانا نے ''اپنے ماحول کی صحیح تشخیص'' کو ذکر کیا تھا، اور حافظ ابن تیمیہ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد امام غزالیؒ سے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ تک، تمام اکابر کے بارے میں اُن کی رائے یہ ہے کہ اُنہوں نے مسلمانوں کے مرض کا صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا بلکہ اُنہیں پھر ''مارفیا کے انجکشن'' دیتے رہے۔ اِن دونوں باتوں کو ایک ساتھ ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ حضرات مجدد تو کیا ہوتے، اُس کی پہلی شرط کو پورا کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھے، کیونکہ یہ تمام اکابر خود صوفی تھے، اور مولانا کے نزدیک ''صوفیت'' ہی مسلمانوں کی اصل بیماری ہے۔ گویا یہ حضرات تو خود ہی صوفیت کے مریض تھے اور ''چنیا بیگم'' سے شغل فرماتے تھے، وہ امت کی مسیحائی کیا کرتے۔ جب اِس امت کے اِن چیدہ برگزیدہ افراد کا یہ حال ہے جنہیں دنیا مجدد اسلام مانتی ہے اور جن کی عظمت کے سامنے خود مولانا کے قلم کا سر بھی خم ہے تو امت کے باقی علماء وصلحاء کا کیا حال ہوگا؟ اس کا اندازہ مولانا مودودی کے نقطۂ نظر سے خود ہی کر لیجئے۔ ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

(۵) جب پوری امت کے اکابر مولانا مودودی اور اُن کے نیاز مندوں کے اعتماد

واحترام سے محروم ہوئے تو اُن کے ذریعہ اور واسطہ سے جو اسلامی علوم ہم تک پہنچے اُن پر اعتماد کیسے ممکن تھا؟ چنانچہ مولانا نے علومِ اسلامی میں سے ایک ایک کا نام لے کر اُس پر بے اعتمادی کا اظہار فرمایا۔ اپنے نیازمندوں کے ذہن میں یہ بات خوب اچھی طرح راسخ کر دی کہ تمام اسلامی علوم میں نئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ علمِ تفسیر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو جدید طرز پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ وہ اپنے لکچروں سے انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کریگا، پھر بی اے میں اُن کو پورا قرآن اِس طرح پڑھا دے گا کہ وہ عربیت میں بھی کافی ترقی کر جائیں گے، اور اسلام کی روح سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں گے''۔
> (تنقیحات ۱۹۳ طبع چہارم)

علمِ حدیث کے بارے میں تفہیمات میں صفحہ ۲۸۷ سے صفحہ ۲۹۸ تک ''مسلکِ اعتدال'' کے عنوان سے مولانا کا ایک مضمون ہے اُس میں موصوف نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی حدیث کا ''صحیح'' ہونا حضرات محدثین کی تصریح پر موقوف نہیں، بلکہ دراصل مزاج شناسیِ رسول پر موقوف ہے۔ مشہور منکرِ حدیث مسٹر غلام احمد پرویز نے ایک موقعہ پر لکھا تھا کہ حدیث کے بارے میں میری رائے بھی اُس سے زیادہ سخت نہیں جو مولانا نے ظاہر فرمائی۔

مولانا کی رائے کا خلاصہ اُنہی کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''محدثین رحمہم اللہ کی خدمت مسلّم، یہ بھی مسلّم کہ نقدِ حدیث کے لئے جو مواد اُنہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدرِ اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے۔ کلام اِس میں نہیں بلکہ صرف اِس امر میں ہے کہ کلیۃً اُن پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے؟ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رہی ہیں اُن سے آگے تو وہ نہیں

جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اُس سے تو اُن کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟'' (ص ۲۹۲ طبع چہارم)

چونکہ مولانا کو صحابۂ کرامؓ سے خاص عقیدت ہے اِس لئے وہ صحابۂ کرام پر جرح کا کوئی نہ کوئی موقع تلاش کر لیتے ہیں۔ احادیث کا مدار چونکہ راویوں پر ہے، اور حدیث کے سب سے پہلے راوی چونکہ صحابۂ کرامؓ تھے اِس لئے حدیث کے سلسلۂ سند کو مشکوک کرنے کے لئے دیگر اویانِ حدیث کے علاوہ خود صحابۂ کرامؓ پر خاک اُڑانا ضروری تھا، چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:

''اول تو رواۃ کی سیرت اور اُن کے حافظہ اور اُن کی دوسری باطنی خصوصیت کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل، دوسرے خود وہ لوگ جو اِن راویوں کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے، انسانی کمزوریوں سے مبرّا نہ تھے''۔ (۲۹۲-۲۹۳)

اس ضمن میں آگے لکھتے ہیں:

''ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جایا کرتے تھے''۔ (ص ۲۹۴)

چونکہ مولانا کے نزدیک علمِ حدیث لائقِ اعتبار نہیں جب تک کہ وہ اُن کی مزاج شناسیِ رسول پر پورا نہ اُترے اِس لئے وہ صحیح، مستند اور پوری امت کی مسلّمہ احادیث کو بلا تکلف ٹھکرا دیتے ہیں، اس کی متعدد مثالیں میرے سامنے ہیں، مگر طوالت کے خوف سے اِن کو قلم انداز کرتا ہوں۔

علم تفسیر و حدیث کے بعد علومِ اسلامیہ میں سب سے اہم اور عظیم الشان علمِ فقہ ہے، اِس سے تو مولانا کو اِس حد تک نفرت ہے کہ بعض اوقات وہ اس پر دوزخ کی وعیدیں تک سنا دیتے ہیں: ''حقوق الزوجین'' میں ایک بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے اِن گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ اِن کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ اِن سے

پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اس لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو، کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اس لئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں۔ ہم نے اپنے دین کو یُسر بنایا تھا، تم کو کیا حق تھا کہ اُسے عُسر بنا دو، ہم نے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا، تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیری کرو[1]۔ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا تم سے کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالمِ دین کو کنزالدقائق، ہدایہ اور عالمگیر کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی، البتہ جہلاء کو جواب دہی کرنے کا یہ موقعہ ضرور مل جائے گا کہ[2]

رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ٥ رَبَّنَا اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ٥ (حقوق الزوجین صفحہ ۹۸)

مولانا کی یہ پوری عبارت اسلافِ امت اور فقہائے امت کے بارے میں اُن کی قلبی کیفیت کا آئینہ ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے بغض و نفرت کی وہ کیفیت ٹپک رہی ہے جو کسی مسلمان کو ادنیٰ مسلمان سے نہیں ہوسکتی چہ جائیکہ اسلافِ امت سے؟ قرآن کریم کی جو دو آیتیں مولانا نے اس مقام پر لکھی ہیں[3] وہ کفار کے بارے میں ہیں کہ وہ قیامت کے دن خدا کے حضور یہ کہیں گے کہ یا اللہ! ہم کو انبیاء علیہم السلام کو دعوت پر لبیک کہنے سے ہمارے سرداروں اور بڑوں

---

[1] گویا مولانا نے پہلے طے کر رکھا ہے کہ امت اسلامیہ کے سلف صالحین قرآن و حدیث کی پیروی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے فتوے قرآن و حدیث کے خلاف ہوتے تھے۔ استغفر اللہ۔

[2] ان دونوں آیتوں کا ترجمہ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں کیا ہے "اے رب ہمارے ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب! ان کو دوہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر" (تفہیم القران جلد ۴ ص ۱۳۴ طبع ششم جون ۱۹۷۲ء)

[3] نئے ایڈیشن میں یہ آیتیں حذف کر دی گئی ہیں۔

نے روکا تھا، ہم اُن کے زیر اثر تھے اِس لئے اصل قصور اُن کا ہے، اُنہیں دوہرا عذاب دیجئے اور اُن کو سخت لعنت کا مورد بنائیے۔

اکابرِ امت کے بارے میں میں مولانا کی یہ تحریر پڑھتا ہوں تو مجھے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مولانا یہ عبارت لکھتے وقت غنودگی کی حالت میں تھے یا وہ خارجیوں کی طرح اسلافِ امت کو واقعۃً خارج از اسلام ہی سمجھتے ہیں۔ کنز الدقائق، ہدایہ اور عالمگیر کے مصنفین تو (اپنی جلالت قدر کے باوجود) محض ناقل ہیں، اُن کا جرم تو بس اتنا ہے کہ انہوں نے یہ مسائل اپنی اپنی کتابوں میں نقل کر دیئے ہیں، ورنہ یہ مسائل خود ان کے نہیں بلکہ ائمہ اجتہاد (امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد رحمہم اللہ) کے ہیں جو اُنہوں نے قرآن وسنت سے نکالے ہیں۔ کیا مولانا کے نزدیک یہی اکابر ''کافروں کے سردار'' ہیں جن کو دوہرا عذاب دینے اور اُن پر سخت لعنت کرنے کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے؟

صد حیف! کہ آج کا ایک لکھا پڑھا آدمی جو بدقسمتی سے منصبِ اجتہاد کی بلندیوں سے ناآشنا ہے اور جس کے لئے ائمہ سلف کی عبارت کا صحیح سمجھنا اور اُسے اپنی زبان میں منتقل کرنا بھی مشکل ہے، وہ امت کے ائمہ اجتہاد کو ''کافروں کے سرداروں'' میں شامل کر دیتا ہے، کیوں؟ محض اس لئے کہ اُسے اپنی رائے کی تائید میں ائمہ اجتہاد کا کوئی فتویٰ نہیں ملتا۔ انصاف کیجئے کیا عقل ودانش کی رو سے صرف اتنی بات اِس بات کا جواز پیدا کر دیتی ہے کہ اکابرِ امت کو اتنی بڑی گالی دے ڈالی جائے؟

میں قبل ازیں بتا چکا ہوں کہ اِس علم نما جہل کے دور میں دین پر ثابت قدم رہنے کے لئے اسلافِ امت اور ائمہ اجتہاد کی انگلی پکڑ کر چلنا لازم ہے، یہ سہارا نہ ہو تو آج کا علم آدمی کے دین وایمان کی حفاظت کے لئے کافی نہیں کیونکہ اگر اسلافِ امت پر اعتماد نہ کیا جائے تو شیطان بہت جلد آدمی کے نفس امارہ کو علم کے ٹٹو پر سوار کر کے ہوا وہوس کی وادیوں میں بھٹکا دیتا ہے، اور کسی کو پرویز، کسی کو چکڑالوی اور کسی کو غلام احمد قادیانی بنا دیتا ہے۔ لیکن صد حیف! کہ مولانا مودودی اسلافِ امت کی اتباع کو جو تریاقِ ایمان ہے، ہر گناہ سے بڑا گناہ ٹھہراتے ہیں اور

''ذہنی غلامی'' کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں، ملاحظہ ہو:

> ''میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید نا جائز اور گناہ بلکہ اُس سے بھی کچھ شدید چیز ہے، مگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک اسکول کے طریقے اور اصول کی اتباع کرنا اور چیز ہے اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز ہے اور یہی آخری چیز ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا''۔۔ (رسائل ومسائل ص۲۴۴ ج ۱ طبع سوم ۱۹۵۷ء)

مولانا کی یہ رائے بھی خود رائی ہے اور اِس غلط رائے کا اصل منشا یہ غلطی ہے کہ مولانا، ہر حرف خوان کو صاحبِ علم سمجھتے ہیں، اور ہر صاحبِ علم کو مجتہد کا منصب تفویض کرتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ مولانا نے اگر ذرا بھی غور و تامل سے کام لیا ہوتا تو اُنہیں نظر آتا کہ اجتہاد کا مقام بہت بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چوتھی صدی کے بعد مجدد الف ثانیؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ تک پوری امت تقلید پر متفق چلی آتی ہے، کیا یہ سارے اکابر، مولانا کے نزدیک ''صاحبِ علم آدمی'' نہیں تھے؟ اور کیا وہ ائمہ اجتہاد کی تقلید کر کے مولانا کے بقول ''ناجائز گناہ بلکہ اُس سے کچھ شدید تر چیز'' کے مرتکب تھے؟

اصل بات وہی ہے جس کو میں عرض کرتا آ رہا ہوں کہ مولانا کو صحابۂ کرامؓ سے لے کر بعد کی صدیوں تک کے اکابرِ امت میں سے کسی پر اعتماد نہیں۔ اِس لئے اُن کے واسطے سے جو علوم نبوت ہم تک پہنچے ہیں مولانا اُن پر بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں۔

علمِ فقہ کے بعد دین کا ایک اہم ترین شعبہ، جس کو پورے دین کی روح کہنا بے جا نہ ہوگا، علمِ تصوف ہے جس کو حدیثِ جبرئیلؑ میں ''احسان'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

قرآنِ کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین فرائض نبوت بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) آیت کی تلاوت (۲) کتاب وحکمت کی تعلیم (۳) تزکیہ۔ یہ تینوں فرائض اپنی جگہ اہم ترین مقاصد ہیں مگر اُن میں بھی الاہم فالاہم کی ترتیب ہے۔ چنانچہ تلاوتِ آیات تمہید ہے تعلیمِ کتاب وحکمت کی اور تعلیمِ کتاب وحکمت تمہید ہے تزکیہ کی۔ گویا نبوت کا کام تلاوتِ آیات

سے شروع اور تزکیہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس لئے مقاصدِ نبوت میں سب سے بڑا، سب سے عالی، سب سے اہم اور غایت الغایات مقصد تزکیہ ہے۔ جسے دوسرے الفاظ میں تعمیرِ سیرت یا انسان سازی کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ تلاوتِ آیات بھی ایک اہم مقصد ہے۔ کوئی شک نہیں کہ کتاب وحکمت کی تعلیم بھی بہت بڑا عالی شان منصب ہے، لیکن یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ اہم مقصد ہونے کے باوجود تزکیہ کے لئے تمہید اور مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شاید یہی نکتہ ہے کہ قرآنِ کریم میں ان سہ گانہ فرائضِ نبوت کا ذکر کرتے ہوئے تلاوتِ آیات کو ہمیشہ مقدم رکھا گیا ہے، جب کہ تزکیہ کو ایک جگہ تعلیمِ کتاب وحکمت سے مؤخر کیا ہے۔ اِس کے علاوہ ہر جگہ اِسے مقدم کیا گیا ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ تلاوتِ آیات کے بغیر نبوت کے کام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ علومِ نبوت کا اول وآخر اور مبدا و غایت تزکیہ ہے۔ واللہ اعلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بیک وقت ان تمام فرائض کی متکفل تھی۔ آپؐ صحابۂ کرامؓ کو خود قرآن کریم کے الفاظ بھی پڑھاتے تھے۔ اُسکے مفہوم ومعانی اور احکام ومسائل کی تعلیم دیتے تھے اور ان کا تزکیہ اور اصلاح وتربیت بھی فرماتے تھے۔

آپؐ کے بعد یہ وراثت امت کے سپرد ہوئی تو اِن تینوں شعبوں پر الگ الگ کام ہونے لگا۔ اگرچہ اکابرِ امت میں بہت سی ہستیاں ایسی بھی ہوئیں جو بیک وقت تینوں کی جامع تھیں، مگر عام طور پر تلاوتِ آیت کا شعبہ ایک مستقل جماعت نے سنبھالا، تعلیمِ کتاب وحکمت کے مختلف النوع شعبوں کے الگ الگ رجالِ کار پیدا ہوئے اور ایک جماعت اصلاح وتربیت اور تزکیۂ نفوس کی خدمت میں لگ گئی۔ جن اکابرِ امت نے اپنے آپ کو اس تیسرے شعبے کے لئے وقف کر دیا وہ صوفیاء کرام اور پیرانِ طریقت کے نام سے معروف ہوئے اور اُن کے شعبہ کا نام ''سلوک وتصوف'' ٹھہرا۔

اِس مختصر سی وضاحت سے معلوم ہوا ہوگا کہ تصوف شریعتِ محمدیہ وعلیٰ صاحبہا (الف الف صلوٰۃ والسلام) سے کوئی الگ چیز نہیں اور نہ صوفیاء کرام ہی کسی اور جہان کی مخلوق ہیں جن کے نام سے بدکا جائے، بلکہ تصوف وراثتِ نبوت کا ایک مستقل شعبہ اور وظائفِ نبوت میں سے ایک

مستقل وظیفہ ہے اور صوفیاء کرام اِس وراثتِ نبوت کے امین اور اِس عظیم الشان شعبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور آپؐ کے جانشین ہیں اور یہ شعبہ اِس قدر اہم اور اتنا نازک ہے کہ نہ اِس کے بغیر مقاصدِ نبوت کی تکمیل ہوتی ہے اور نہ یہ امت ہی اپنے اِس فریضہ سے عہدہ برآ ہوتی ہے جو اِس کے ذمہ عائد کیا گیا ہے۔

حضرات صوفیاء کرام پوری امت کی جانب سے تشکر و امتنان اور جزائے خیر کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے اِس نازک ترین فریضہ کو سنبھالا اور نہایت خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ افرادِ امت کی اصلاح و تربیت، تزکیۂ نفوس اور انسان سازی کا کام کیا، اگر یہ نہ ہوتا تو یہ امت وراثتِ نبوت کے اِس شعبہ سے محروم، عالم نما جاہلوں کی بھیڑ ہوتی۔

امت کو اگر میدانِ جہاد میں سربکف جانبازوں کی ضرورت ہے، اگر مکاتب و مدارس اور دانش کدوں میں لائق اساتذہ کی ضرورت ہے، اگر ایوانِ عدالت میں عدل پرور قاضیوں اور ججوں کی ضرورت ہوتی ہے، اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبہ میں تحقیق کرنے والوں کی ضرورت ہے، اگر ہر شعبۂ زندگی کو زندہ و توانا رکھنے کے لئے الگ الگ مخصصین کی ضرورت ہے تو یقیناً انسان سازی کے کارخانوں میں انسانوں کو انسان بنانے والوں کی بھی ضرورت ہے۔ انسان سازی کے یہ کارخانے خانقاہیں ہیں اور جو حضرات انسان سازی کا کام کر رہے ہیں، اُنہیں صوفیاء کہا جاتا ہے۔

میری طرح مولانا مودودی نے چونکہ اِس کوچہ میں گھوم پھر کر نہیں دیکھا، اُدھر بدقسمتی سے زمانے کی فضا کچھ ایسی ہے کہ دنیا کو انسان کے گردوپیش پھیلی ہوئی چیزوں کی ضرورت تو نظر آتی ہے مگر خود "انسان" کی انسانیت کو ایک بے ضرورت چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ اس لئے عام ذہن یہ بن گیا ہے کہ صوفیاء کرام اور اُن کی خانقاہیں دنیا کی سب سے زیادہ بے ضرورت چیز ہیں۔ آخر اس ترقی کے دور میں انہوں نے انسان سازی کی فیکٹریاں کیوں کھول رکھی ہیں؟ زمانے کی اس فضا سے متاثر ہو کر مولانا مودودی بھی صوفیائے کرام سے بے حد ناراض ہیں اور وہ علم تصوف کا ایسا مذاق اڑاتے ہیں جس کی توقع کم از کم کسی عالمِ دین سے نہیں کی جاسکتی، وہ سمجھتے ہیں کہ جس نے قرآن و حدیث کے نقوش پڑھ لئے اُس کی اصلاح آپ سے آپ ہو جاتی ہے اور اُسے کسی کے جوتوں میں

جا کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں، حالانکہ اگر حرف خوانی کا نام علم ہوتا، اور اگر اسی سے اصلاح وتزکیہ ہو جایا کرتا تو امام غزالی کو نظامیہ چھوڑ کر مارے مارے پھرنے اور ''المنقذ من الضلال'' میں اپنی سرگزشت لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر علم صرف ''خواندن'' کا نام ہوتا تو آج کے مغربی مستشرقین، مولانا سے زیادہ وہ عالم کہلانے کے مستحق ہوتے۔

(۶) چونکہ مولانا مودودی کی نظر میں پوری امت نالائقِ اعتماد اور اُس کے ذریعہ حاصل ہونے والے سارے علوم محلِ نقد ونظر تھے اس لئے مولانا کو دین فہمی کے لئے صرف اپنے علم وفہم اور اپنی صلاحیتوں پر انحصار کرنا پڑا، وہ لکھتے ہیں:

''میں اپنا دین معلوم کرنے کے لئے چھوٹے یا بڑے علماء کی طرف دیکھنے کا محتاج نہیں ہوں بلکہ خود خدا کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت سے معلوم کرسکتا ہوں کہ دین کے اصول کیا ہیں۔ اور یہ بھی تحقیق کرسکتا ہوں کہ اِس ملک میں جو لوگ دین کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں وہ کسی خاص مسئلہ میں صحیح مسلک اختیار کر رہے ہیں یا غلط؟ اس لئے میں اپنی جگہ پر مجبور ہوں کہ کچھ قرآن وسنت سے حق پاؤں اُسے حق سمجھوں بھی اور اس کا اظہار بھی کروں''۔

(روئداد اجتماع جماعت اسلامی الہ آباد ص ۴۳۔ ترجمان القرآن مئی ۱۹۴۶ء)

''میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن وسنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے میں نے کبھی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے، یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن مجید کیا کہتا ہے اور رسول اللہ علیہ وسلم نے کیا کہا''۔ (روئداد جماعت اسلامی حصہ سوم ص ۱۰۲، طبع سوم، مارچ ۱۹۶۳ء)

بغیر واسطۂ اسلاف کے دین فہمی کی کوشش ہی دراصل ان تمام فتنوں کی جڑ ہے جو آج

ہمارے گردوپیش میں منڈلا رہے ہیں، ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ ہم قرآن وسنت سے اپنا دین معلوم کر رہے ہیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ برعکس اِس کے اسلافِ امت سے بے نیاز ہو کر لوگ قرآن وسنت کو ''معیارِ حق'' بنانے کے بجائے دراصل اپنے فکر وفہم کو ''معیارِ حق'' قرار دیتے ہیں۔ مثلاً مسٹر غلام احمد پرویز کا یہ دعویٰ ہے کہ اُن کے تمام نظریات کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے (پرویز صاحب حدیث کو نہیں مانتے مگر ''سنت'' کو ماننے کا دعویٰ وہ بھی کرتے ہیں) قادیانی امت کا دعویٰ ہے کہ وہ جو کچھ کہتی ہے قرآن وسنت سے کہتی ہے، اور ٹھیک یہی دعویٰ مولانا مودودی کا ہے کہ وہ جو کچھ لیتے ہیں، بلاواسطہ قرآن وسنت سے لیتے ہیں۔ یہ تین فریق جو اپنے نظریات کے کتاب وسنت پر مبنی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لفظی طور پر قرآن وسنت کے ماننے سے اِن میں سے کسی کو انکار نہیں، بحث یہ ہے کہ قرآن وسنت کے نام سے ہمارے سامنے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ اس کے جانچنے کا معیار ہمارے پاس کیا ہے؟ ہم کس کسوٹی پر رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مودودی کے نظریات صحیح ہیں اور مسٹر پرویز اور قادیانی امت کے نظریات غلط ہیں؟ یہ کسوٹی اور یہ معیار، اسلافِ امت کا فہم ہے، یعنی قرآن وسنت کا جو مفہوم سلفِ صالحین اور اکابرِ امت نے سمجھا وہ صحیح ہے اور جو اِس کے خلاف ہو وہ غلط ہے۔ اِس کے برعکس قادیانی، پرویز اور خود مولانا مودودی اِس معیار کے قائل نہیں، وہ اِس پیمانے کو توڑ دینا چاہتے ہیں اور دین فہمی میں حال یا ماضی کے اشخاص کے زیرِ بارِ احسان نہیں رہنا چاہتے بلکہ براہ راست قرآن وسنت سے اُنہیں جو کچھ سمجھ میں آئے اُسے ''دین'' سمجھنے پر بضد ہیں۔ کتاب وسنت سے براہ راست جو کچھ اُنہوں نے سمجھا ہے وہ اُن کے نزدیک حق ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ باطل ہے۔ گویا حق وباطل کا اصل معیار قرآن وسنت نہ ہوا بلکہ قرآن وسنت کا وہ فہم ہوا جس کا ہر ایک کو دعویٰ ہے۔

یہ ہے وہ اصل نکتہ جس پر مولانا مودودی سے مجھے اختلاف ہے۔ میرے نزدیک ''معیارِ حق'' قرآن وسنت کا وہ فہم ہے جو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے سے آج تک نسلاً بعد نسل متوارث چلا آتا ہے اور مولانا مودودی کے نزدیک حال یا ماضی کے اشخاص کو درمیان میں واسطہ بنانا ہی غلط۔ اس لئے اُن کے نزدیک ''معیارِ حق'' خود اُن کا ذاتی فہم ہے جو

براہ راست اُنہیں قرآن وسنت میں حاصل ہے۔

(۷) سلفِ صالحین کے بجائے خود اپنی ذاتی رائے اور ذاتی علم وفہم پر اعتماد کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ سلفِ صالحین کے نزدیک دین کا جو تصور تھا، مولانا کا دینی تصور اُس سے مختلف ہوتا، سلف صالحین قرآن حکیم کو جس نقطہ نظر سے دیکھتے تھے، مولانا کا زاویۂ نظر اُس سے الگ ہوتا۔ ان کابر کی نظر میں دین کا جو خاکہ، جو نقشہ اور جو نظام تھا، مولانا کے ذہن میں دین کا خاکہ اُس سے جدا ہوتا، ایسا ہونا ایک ناگریز امر تھا، اور یہی ہوا۔

مولانا مودودی کے نزدیک دینِ اسلام ایک سیاسی تحریک کا نام ہے جو زمین پر خدا تعالیٰ کا اقتدارِ اعلیٰ قائم کرنے کے لئے برپا کی گئی۔ مولانا لکھتے ہیں:

"اسلامی تحریک میں ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اِس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک، اور قیام کے بعد اِس اسٹیٹ کی شکل ودستور تک، ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں"۔

"اس دوران میں تحریک کے "لیڈر" نے اپنی تحریک کے اصول کا اور ہر اُس چیز کا جس کے لئے تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا ہے"۔

"مگر جس لیڈر کو اللہ نے راہنمائی کے لئے مقرر کیا تھا، اُس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے اُن بہت سے مسائل میں سے کسی مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ دی[۱] بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اُسی الٰہ کی بندگی قبول کرو"۔ (اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ص ۲۳ ص ۲۴ ص ۳۲)

اسلام کو ایک سیاسی تحریک کی حیثیت سے پیش کرنا اور انبیاء کرام کو اس تحریک کے "لیڈر"

---

۱ اسی فلسفہ کی روشنی میں مولانا، انگریز کے خلاف آزادی کی تحریک میں حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ حصہ لینے کو بھی غلط سمجھتے تھے۔

قرار دیا دین کا وہ تصور ہے جس سے اس کی روح مسخ ہو کر رہ جاتی ہے، اور اس کا پورا نظام کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد گرامی ہے جس کو ہر عام و خاص جانتا ہے کہ اسلام کی بناء پانچ چیزوں پر ہے۔ (۱) کلمہ شہادت کا اقرار (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوۃ دینا (۴) بیت اللہ کا حج کرنا (۵) ماہِ رمضان کے روزے رکھنا۔

اسلام کے پانچ بنیادی ارکان خود مقصود بالذات ہیں اور دین کا سارا نظام انہی پانچ کے گرد گھومتا ہے، حتیٰ کہ جہاد ہے تو ان پانچ کے لئے، ہجرت ہے تو اِن پانچ کی خاطر، اور سیاست ہے تو اِن پانچ ارکان کے لئے، دین کے باقی تمام اعمال واخلاق گویا ان ہی پانچ سے نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جو عظمت اِن ارکانِ خمسہ کی ہے وہ کسی اور عمل کی نہیں۔ لیکن مولانا کے دینی خاکہ میں اصل الاصول زمین پر اسلام کی سیاست وحکمرانی قائم کرنا ہے اور دین کا سارا نظام، عقائد، عبادت، اخلاق، معاملات، معاشرت حتیٰ کہ یہ ارکان خمسہ بھی اِسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے کہ پورا دین خدا تعالیٰ کا نازل کردہ ایک سیاسی نظام ہے، جس کا مقصد حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے۔ یہ دین کی روح ہے اور باقی سب اُس کے مختلف مظاہر یا اس کی ٹریننگ ہے، مولانا لکھتے ہیں:

> ”سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریق ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے، جس میں اِدھر اُدھر سے مختلف چیزیں ملا کر جمع کر دی گئی ہوں، بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے، جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اُس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک، ہر چیز اُس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے ہیں اُن سب کی روح اور اُن کا جوہر اُس کے اصول اولیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ اِن اصول اولیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اُسی طرح نکلتی

ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں، جڑوں سے تنہ اور تنہ سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اُس کی ایک ایک پتی، اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ناگریز ہے کہ اُس کی جڑ کی طرف رجوع کریں کیونکہ اِس کے بغیر آپ اِس کی روح کو نہیں پاسکتے''۔ (اسلامی ریاست ص ۲۰ ص ۲۱ طبع اول مارچ ۱۹۶۲ء)

دین کی جڑ اور روح کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی کے لئے جو نظام مرتب کیا ہے اُس کا مرکز و محور، اُس کی روح اور اُس کا جوہر یہی عقیدہ ہے اور اِسی پر اسلام کے نظریۂ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا سنگِ بنیاد یہ قاعدہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کر لئے جائیں اور کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اُس کی اطاعت کریں، وہ قانون بنائے اور دوسرے اُس کی پابندی کریں، یہ اختیار صرف اللہ کو ہے''۔ (ص ۳۴)

مولانا کے نزدیک سیاسی اقتدار قائم کرنا ہی اصل عبادت ہے اور نماز روزہ وغیرہ عبادات کی حیثیت محض فوجی مشقوں کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''یہ ہے اُس عبادت کی حقیقت جس کے متعلق لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض نماز روزہ اور تسبیح و تہلیل کا نام ہے اور دنیا کے معاملات سے اُسے کوئی سروکار نہیں، حالانکہ دراصل صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ اور ذکر و تسبیح، انسان کو اِس بڑی عبادت کے لئے مستعد کرنے والی تمرنیات ہیں''۔ (تفہیمات طبع چہارم ص ۵۲)

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ دینِ اسلام کے مختلف شعبے ہیں جن کو عقائد،

عبادات، اخلاق، معاشرت، معاملات اور سیاست کے بڑے بڑے عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔اس لئے سیاست بھی بلاشبہ دین کا ایک حصہ ہے۔شریعت نے اس کے احکام وقوانین بھی دیئے ہیں مگر پورے دین کو ایک سیاسی تحریک بنا دینا اور اُس کے سارے شعبوں کو اُسی محور پر گھمانے کی کوشش کرنا اور عقائد وعبادات کو اسی سیاست کے خادم کی حیثیت دے ڈالنا، اتنی خطرناک غلطی ہے جسے میں نرم الفاظ میں ''فکری کجروی'' سے تعبیر کرنے پر مجبور ہوں۔مولانا کی فکری کجروی ہی کا نتیجہ ہے کہ جن عبادات اور جن اخلاق کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ اہمیت دی تھی، جن کے بے شمار فضائل بیان فرمائے تھےاور جن پر جنت کی بشارتیں سنائی تھیں، وہ مولانا کی نظر میں نہ صرف ایک ثانوی مقصد بن کر رہ جاتے ہیں، بلکہ مولانا اِن عبادات کا اس طرح تمسخر اڑاتے ہیں کہ روحِ ایمان کانپ جاتی ہے۔ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر پڑھئے!

''خواص نے اِس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کیا۔وہ تسبیح ومصلّٰی لے کر حجروں میں بیٹھ گئے۔خدا کے بندے گمراہی میں مبتلا ہیں، دنیا میں ظلم پھیل رہا ہے، حق کی روشنی پر باطل کی ظلمت چھارہی ہے، خدا کی زمین پر ظالموں اور باغیوں کا قبضہ ہو رہا ہے، الٰہی قوانین کے بجائے شیطانی قوانین کی بندگی خدا کے بندوں سے کروائی جارہی ہے مگر یہ ہیں کہ نفل پر نفل پڑھ رہے ہیں، تسبیح کے دانوں کو گردش دے رہے ہیں، ہوحق کے نعرے لگا رہے ہیں۔قرآن پڑھتے ہیں محض ثوابِ تلاوت کی خاطر، حدیث پڑھتے ہیں مگر صرف تبرکاً، سیرتِ پاک اور اُسوۂ صحابہؓ پر وعظ فرماتے ہیں، مگر قصہ گوئی کا لطف اٹھانے کے سوا کچھ مقصود نہیں۔دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کا سبق نہ اُن کو قرآن میں ملتا ہے نہ حدیث میں، نہ سیرتِ پاک میں، نہ اسوۂ صحابہ میں۔کیا یہ عبادت ہے؟'' (تفہیمات ص ۵۹ طبع چہارم ۱۹۴۷ء)

میں یہاں اِس پر بحث نہیں کرتا کہ علمائے امت نے کب دعوت الی الخیر، امر بالمعروف

ونہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کے فریضہ سے کوتاہی کی ہے؟ میں اس بحث کو بھی چھوڑتا ہوں کہ مولانا اور اُن کے نیازمندوں نے آج تک غلط سلط لٹریچر پھیلانے اور قوم کے نوجوانوں کو چند نعروں کے سلوگن دینے کے سوا وہ کون سا تیر مارا ہے جس سے ''خواص'' محروم رہے ہیں؟ میں اِس بحث سے بھی قطع نظر کرتا ہوں کہ جب علمائے امت انگریزی طاغوت کے خلاف سینہ سپر ہو کر مصروف جہاد تھے اور قید و بند اور دار و رسن کی تاریخ، خامہ و قرطاس سے نہیں بلکہ جہد و عمل سے لکھ رہے تھے۔ تب مولانا اور اُن کے رفقاء ''حکومتِ الٰہیہ'' کے خلائی سفر پر تھے اور اُن کو ایک دن کے لئے بھی طاغوت کے خلاف میدان جہاد میں اُترنے کی توفیق نہیں ہوئی بلکہ اُن مجاہدین کے خلاف فتوے صادر فرماتے رہے۔ میں اِن ساری باتوں کو یہاں چھوڑتا ہوں۔ میں یہاں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تقسیمِ کار کے طور پر اللہ کے کچھ بندے ذکر و تسبیح کی مشق کرانے میں لگے ہوئے ہوں، کچھ قرآن کریم کی تلاوت و تعلیم کی خدمت انجام دے رہے ہوں، کچھ دینی علوم کے تحفظ کا فریضہ بجالا رہے ہوں، کچھ بقول آپ کے تسبیح و مصلّٰی لے کر حجروں میں بیٹھ گئے ہوں اور نفل پر نفل پڑھ کر، امتِ محمدیہ کی دعاؤں سے مدد کر رہے ہوں، کیا آپ کے سیاسی اسلام میں یہ سب اِس لئے گردن زدنی ہیں کہ وہ باہر سڑکوں پر نکل کر ''اسلامی نظام، اسلامی نظام'' کے نعرے کیوں نہیں لگاتے؟ میں بہ ادب پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر آپ اِن کی کس بات کا مذاق اڑاتے ہیں؟ کیا آپ کے نزدیک تسبیح و مصلّٰی، نفل پر نفل، تلاوتِ قرآن، حدیث پاک کا درس و تدریس، سیرتِ پاک اور اسوۂ صحابہؓ کا وعظ، یہ ساری چیزیں ایسی بے قیمت ہیں کہ آپ ان کا مذاق اڑانے لگیں؟

کیا آپ نے اپنے رسالہ ''ترجمان القرآن'' پڑھنے پر کبھی کسی کا مذاق اڑایا ہے؟ کیا تلاوتِ قرآن کی اہمیت آپ کے رسالے کی تلاوت جتنی بھی نہیں؟ اسلامی عبادات کا مذاق اڑانے کے بارے میں فقہائے امت کی تصریحات واضح ہیں اور یہ حرکت اُسی شخص سے صادر ہوسکتی ہے جس کا دل ایمان کے نور اور عبادت کی عظمت سے خالی ہو، لیکن مولانا کے نزدیک اسلام ایک سیاسی تحریک کا نام ہے (**لادین الا السیاسۃ**) اِس لئے وہ کسی بڑی سے بڑی عبادت کو اُس وقت تک کوئی اہمیت نہیں دیتے جب تک کہ وہ سیاسی تحریک کے لئے مفید نہ ہو۔

اس لئے وہ بات بات پر عبادات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ''تجدید واحیائے دین'' میں امام مہدی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''مسلمانوں میں جو لوگ ''الامام المہدی'' کے قائل ہیں وہ بھی اُن متجددین سے جو اس کے قائل نہیں، اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ وضع قطع کے آدمی ہوں گے، تسبیح ہاتھ میں لئے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہوں گے، آتے ہی انا المہدی کا اعلان کریں گے، علماء اور مشائخ کتابیں لئے پہنچ جائیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے اُن کے جسم کی شناخت وغیرہ کا مقابلہ کر کے انہیں شناخت کرلیں گے، پھر بیعت ہوگی، اور اعلان جہاد کر دیا جائے گا۔ چلے کھینچے ہوئے درویش اور پرانے طرز کے ''بقیۃ السلف'' اُن کے جھنڈے تلے جمع ہونگے، تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لئے برائے نام چلانی پڑے گی، اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے ہوگا، پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے، جس کافر پر نظر ماردیں گے تڑپ کر بے ہوش ہو جائے گا اور محض بددعاء کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑجائیں گے''۔ (ص ۵۵ طبع ششم مارچ ۱۹۵۵ء)

میں کسی طرح یقین نہیں کر پاتا کہ ایسی سوقیانہ افسانہ طرازی کسی عالم دین کے قلم سے بھی نکل سکتی ہے، مگر مولانا کو اہل اللہ کی شکل وصورت سے جو نفرت ہے اور اُن کے اعمال واشغال سے جو بغض وعداوت ہے، اُس نے اُنہیں ایسے غیر سنجیدہ مذاق پر مجبور کر دیا ہے۔

کس احمق نے ان سے کہا ہے کہ ''اصل میں سارا کام برکت اور تصرف سے ہوگا''؟ لیکن کیا مولانا کہہ سکتے ہیں کہ سارا کام بغیر برکت اور تصرف کے ہو جائے گا؟ جس طرح اُنہوں نے ''الامام المہدی'' کی وضع قطع اور اُن کی برکت وتصرف کا مذاق اڑایا ہے، کیا یہی طرزِ فکر کوئی

شخص نعوذ باللہ آنحضرت (ﷺ) کے بارے میں اختیار کرے اور اسی طرح معاذ اللہ آپ کی وضع قطع اور آپؐ کی برکت وتصرف کا مذاق اڑانے لگے تو مولانا مودودی اُسے کیا جواب دیں گے؟ کیا مولانا، انبیاء کرام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامت کے بھی منکر ہیں؟

جنگِ بدر کا جو میدان، لشکرِ جرار کے مقابلے میں دو گھوڑوں، آٹھ تلواروں اور تین سو تیرہ جانبازوں کے ذریعہ جیتا گیا تھا کیا وہ برکت وتصرف کے بغیر ہی جیت لیا گیا تھا؟ ''العریش'' میں خدا کا پیغمبر (فِدَاهُ اَبِیْ وَاُمِّیْ وَرُوْحِیْ وَجَسَدِیْ ﷺ) جو ساری رات بلبلاتا رہا، اور جس نے بے خودی اور ناز کی کیفیت میں خدا تعالیٰ کی بارگاہِ صمدیت میں یہ تک کہہ دیا تھا:

اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَةَ فَلَنْ تُعْبَدَ بَعْدَ الْیَوْمِ.

ترجمہ: اے اللہ! اگر یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی تو آج کے بعد تیری عبادت نہیں ہوگی۔

کیا خدا کی قدرت اس ''برکت وتصرف'' کے بغیر نازل ہوگئی تھی؟ اور ''شاہت الوجوہ'' کہہ کر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کی مٹھی پھینکی تھی، جس کو قرآن کریم نے:

وَمَارَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی.

ترجمہ: وہ مٹھی جب آپؐ نے پھینکی تھی تو دراصل آپؐ نے نہیں، بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔

فرمایا ہے: کیا مولانا کے نزدیک یہ ''برکت وتصرف'' نہیں تھا؟ اگر مولانا ''الامام المہدی'' کی ''برکت وتصرف'' کا مذاق اڑاتے ہیں تو کیا کوئی دوسرا ملحد ذرا آگے بڑھ کر ''یوم الفرقان'' کو (جنگ بدر کا دن، جسے قرآن کریم نے فیصلے کا دن فرمایا ہے) اِسی طرح افسانہ طرازی قرار دے کر اس کا مذاق نہیں اڑا سکتا؟ صد حیف! دین اور اہلِ دین کا اِس سوقیانہ انداز میں مذاق اڑانے والے ''مفکرِ اسلام'' بنے بیٹھے ہیں۔ ع

''تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

اب ذرا ''الامام المہدی'' کے بارے میں مولانا کی رائے بھی سن لیجئے! ارشاد ہوتا ہے:

''میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل ''جدید ترین طرز کا لیڈر'' ہوگا۔ وقت کے تمام علومِ جدیدہ پر اُس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی ریاست، سیاسی تدبر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جمادے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اُس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے''۔ (ص ۵۵)

یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ ایک منصوص چیز جو ابھی پردۂ مستقبل میں ہے، اُس کے بارے میں مولانا کو اپنی اٹکل اور اندازے سے پیش گوئی کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا وہ ''الامام المہدیؑ'' کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو کافی نہیں سمجھتے؟ اور یہ کہ مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی یا تو کشف والہام سے کی جاتی ہے، یا فراست صحیحہ سے، یا کچھ لوگ علمِ نجوم کے ذریعہ الٹی سیدھی ہانکتے ہیں، مولانا نے ''الامام المہدیؑ'' کے بارے میں جو ''اندازہ'' لگایا ہے اس کی بنیاد آخر کس چیز پر ہے؟

اور میں مولانا کے اِس اندیشہ کے بارے میں بحث نہیں کرتا کہ امام مہدی کی ''جدتوں'' کے خلاف غریب مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے کیوں شورش برپا کریں گے۔ کیا مولانا کے خیال میں ''الامام المہدیؑ'' کی یہ ''جدتیں'' دین کے مسائل میں ہوں گی یا دنیا کے انتظام میں؟ اگر دین کے مسائل میں ہوں گی تو وہ مجدد ہوں گے یا خود مولانا کی اصطلاح کے مطابق متجدد؟ اور اگر مولانا کی مفروضہ ''جدتیں'' دنیا کے انتظامی امور میں ہوں گی تو مولانا کو کیسے اندیشہ ہوا کہ غریب مولوی اور صوفی اس کی مخالفت کریں گے؟

اِن تمام امور سے قطعِ نظر جو بات میں مولانا سے یہاں دریافت کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بقول اُن کے ''الامام المہدیؑ'' کو برکت وتصرف کی تو ضرورت نہ ہوگی، نہ وہاں تسبیح وسجادہ کا گذر ہوگا، نہ ذکر وتہلیل کا قصہ چلے گا، بلکہ بقول مولانا کے الامام المہدی ایک ماڈرن قسم کے لیڈر

ہوں گے، علومِ جدیدہ میں اُن کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی، زندگی کے مسائل مہمہ کو خوب خوب سمجھتے ہوں گے، سیاست و ریاست اور جنگی تدبیروں میں اُن کی دھوم مچی ہوگی، اِس طرح وہ ساری دنیا پر اپنا سکہ جما دیں گے۔

سوال یہ ہے کہ مولانا کی ذاتِ گرامی میں آخر کس چیز کی کمی ہے۔ یہ ساری باتیں جو مولانا نے ''الامام المہدی'' کے لئے لکھی ہیں، ایک ایک کر کے ماشاء اللہ خود مولانا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ خدا کے فضل سے جدید ترین طرز کے لیڈر بھی ہیں، تمام علوم جدیدہ میں اُن کو مجتہدانہ بصیرت بھی حاصل ہے۔ زندگی کے سارے مسائل مہمہ پر نہ صرف اُن کی نظر ہے بلکہ ایک ایک مسئلے پر اُن کے قلم نے لکھ لکھ کر کاغذوں کا ڈھیر لگا دیا ہے اور سیاسی تدبّر کی ساری باتیں بھی انہوں نے ذہن سے کاغذ پر منتقل کر دی ہیں۔ آخر کیا بات ہے کہ ''الامام المہدی'' کے بارے میں ذکر کردہ ساری صفات کے ساتھ متصف ہونے کے باوجود اُن کی تحریک کاغذی گھوڑے دوڑانے سے آگے نہیں بڑھ سکی اور ساری دنیا پر کیا، نصف صدی کی لگاتار خامہ فرسائی کے نتیجہ میں ایک پاکستان پر بھی اُن کا سکہ نہ جم سکا اور پاکستان کیا، ایک چھوٹی سی بستی میں بلکہ اپنے منصورہ میں بھی وہ آج تک حکومت الٰہیہ قائم نہیں کر سکے۔ آخر الامام المہد ی بقول مولانا کے کوئی مافوق الفطرت ہستی تو نہیں ہوں گے۔ اب اگر برکت وتصرف ذکر ودعاء تسبیح و مصلیٰ اور حق تعالیٰ سے مانگنا اور لینا، یہ ساری صفات ان کی زندگی سے خارج کر دی جائیں تو آخر وہ اپنی ''جدتوں'' کے کرشمے سے ساری دنیا پر اپنا سکہ کیسے جما دیں گے؟ کیا مولانا نے مستقبل کے بارے میں اٹکل پچو تخمینے لگاتے وقت اس سوال پر بھی غور فرمایا ہے؟

دراصل مولانا کو ''الامام المہدی'' کی آڑ میں اہل اللہ کی وضع قطع، خانقاہ و مدرسہ، برکت اور روحانی تصرف کا مذاق اڑانا تھا اور بس ورنہ مولانا اپنی قیاس آرائی کی عقلی و منطقی توجیہ سے شائد خود بھی قاصر ہیں۔

کاش! جب مولانا، ''الامام الہدی'' کی آڑ میں محض اپنے اندازوں اور قیاسوں کی بنا پر

شعائرِ دین کا مذاق اڑا رہے تھے کوئی شخص ان کے کان میں شیخ سعدیؒ کا شعر کہہ دیتا:

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

(۸) شریعتِ اسلامیہ کا مأخذ چار چیزیں ہیں جنہیں ''اُصول اربعہ'' کہا جاتا ہے یعنی قرآنِ کریم، حدیثِ نبویؐ، اجماعِ امت اور مجتہدینِ امت کا اجتہاد و استنباط۔ اسلافِ امت سے بے نیاز ہو کر جب مولانا مودودی نے اسلام کا ''آزاد مطالعہ'' کیا تو اِن چاروں مآخذ کے بارے میں ان کا رویہ بڑا عبرت آمیز تھا۔ قرآن کریم کے بارے میں تو موصوف نے یہ فرمایا کہ رفتہ رفتہ اُس کی اصل تعلیم ہی بھول بھلا گئی تھی اور اپنے زمانۂ نزول کے بعد یہ کتاب نعوذ باللہ بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ اپنے رسالہ ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' میں وہ لکھتے ہیں کہ ''الٰہ، رب، دین، عبادت، یہ چار لفظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں'' اور بنیادی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ:

> ''قرآن کی تعلیم کو سمجھنے کے لئے ان چار اصطلاحوں کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھنا ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص یہ نہ جانتا ہو کہ الٰہ اور رب کا مطلب کیا ہے؟ عبادت کی کیا تعریف ہے اور دین کسے کہتے ہیں تو دراصل اس کے لئے پورا قرآن بے معنی ہو جائے گا، وہ نہ توحید کو جان سکے گا، نہ شرک کو سمجھ سکے گا، نہ عبادت کو اللہ کے لئے مخصوص کر سکے گا اور نہ دین ہی اللہ کے لئے خالص کر سکے گا۔ اِسی طرح اگر کسی کے ذہن میں اِن اصطلاحوں کا مفہوم غیر واضح اور نامکمل ہو تو اُس کے لئے قرآن کی پوری تعلیم غیر واضح ہوگی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کا عقیدہ اور عمل دونوں نامکمل رہ جائیں گے۔'' (ص ۱۰۰۹)

مختصراً اِن چار بنیادی اصطلاحوں کی جو اہمیت مولانا نے ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ان چار اصطلاحوں کا مفہوم ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو تو دراصل اس کے لئے پورا قرآن بے معنیٰ ہو جائے گا''۔

اس کے بعد مولانا ہمیں بتاتے ہیں کہ عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ ان الفاظ کا اِطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے اور صرف مسلمان ہی نہیں، کافر تک قرآن کی ان اصطلاحات کے عالم تھے۔

''لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ اِن سب الفاظ کے وہ اصل معنی جو نزولِ قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وُسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہو گیا۔ اِس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے اُن کے لئے الٰہ اور رب اور دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزولِ قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے۔ انہی دونوں وجوہ سے دورِ اخیر کی کتبِ لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے اُن معانی سے کی جانے لگی جو بعد میں مسلمان سمجھتے تھے''۔ (ص۱۲)

اور ان چار بنیادی اصطلاحوں سے امت کی غفلت و جہالت کا نتیجہ کیا ہوا؟

''پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی''۔ (ص۱۴ طبع دہم)

ممکن ہے مولانا کے نیاز مندوں کے نزدیک ان کی یہ تحقیق ایک لائق قدر علمی انکشاف کہلانے کی مستحق ہو مگر میں اسے قرآن کریم کے حق میں گستاخی اور امت اسلامیہ کے حق میں سوءِ ظن بلکہ تہمت سمجھنے اور کہنے پر مجبور ہوں۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ زمانہ نزولِ قرآن کے غیر مسلم تک قرآن کی ان چار اصطلاحوں کا مطلب سمجھتے تھے لیکن بعد کی پوری امتِ مسلمہ قرآن سے جاہل رہی اور قرآن کریم معاذ اللہ ایک بے معنی اور مہمل کتاب کی حیثیت

سے پڑھا جاتا رہا۔ خدنخواستہ مولانا مودودی عالم وجود میں قدم نہ رکھتے اور قرآن کریم کی ان چار اصطلاحوں کی گرہ نہ کھولتے تو کوئی بندۂ خدا، خدا کی بات ہی نہ سمجھ پاتا۔

مولانا کا یہ نظریہ نہ صرف پوری امت کی تضلیل وتذلیل ہے، بلکہ قرآن کریم کے بارے میں ایک ایسے مایوسانہ نقطۂ نظر کا اظہار ہے جس سے ایمان بالقرآن کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ کیا خدا کی آخری کتاب کے بارے میں تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک مختصر سے عرصہ کے بعد اس کی تعلیم اور اس کی حقیقی روح دنیا سے گم ہو جائے، قرآن ایک بے معنی کتاب کی حیثیت سے لوگوں کے ہاتھ میں رہ جائے اور اس کی حقیقی تعلیم ایک بھولی بسری کہانی بن کر رہ جائے؟ مجھے مولانا کا پاسِ ادب ملحوظ نہ ہوتا تو میں اس نظریہ کو خالص جہل بلکہ جنون سے تعبیر کرتا۔

قرآن کریم کی تعلیم کا آفتاب، قیامت تک چمکنے کے لئے طلوع ہوا ہے، لیل ونہار کی لاکھوں گردشیں، تہذیب ومعاشرت کی ہزاروں بوقلمونیاں اور زمانے کے سینکڑوں انقلاب بھی اِس آفتابِ صداقت کو دھندلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اس لئے مولانا کا یہ نظریہ قطعاً غلط اور گمراہ کن ہے۔ مولانا کی اس غلطی کا منشاء تین چیزیں ہیں:

اول: یہ کہ انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ط

ترجمہ: بے شک ہم نے ہی یہ ''الذکر'' نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اور اس حفاظت سے قرآن کریم کے صرف الفاظ ونقوش کی حفاظت مراد نہیں بلکہ اِس کے مفہوم ومعنی، اِس کی دعوت وتعلیم اور اِس کے پیش کردہ عقائد واعمال کی حفاظت مراد ہے۔ بلکہ اِس سے بڑھ کر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ تمام اسباب وذرائع جن کی عالمِ اسباب میں حفاظتِ قرآن کے لئے کسی درجہ میں بھی ضرورت تھی، آیت کریمہ میں اُن سب کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے، ''الذکر'' کی حفاظت کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے حروف والفاظ بھی باقی رہیں گے، اس کے مفہوم ومعانی بھی قائم ودائم رہیں گے اور اس کی تعلیم بھی اعتقاداً وعملاً وحالاً و

قالاً ہر اعتبار سے باقی رہے گی۔ اس لئے مولانا کا یہ کہنا کہ رفتہ رفتہ یہ کتاب اُمت کے لئے ایک بے معنی اور مہمل کتاب بنکر رہ گئی تھی دراصل حفاظتِ قرآن کا انکار ہے۔

دوسرے، مولانا نے اِس پر بھی غور نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا تقاضا یہ ہے کہ آپؐ کی تعلیم غیر متبدل شکل میں قیامت تک دائم وقائم رہے اور اس کا سلسلہ ایک لمحہ کے لئے بھی ٹوٹنے نہ پائے، کیونکہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی مسئلہ میں تعلیم نبوت اُٹھ جائے تو نبیؐ اور امت کے درمیان ایک ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جس کو پاٹنا ممکن نہیں اور اس منطق سے دینِ اسلام کی ایک ایک چیز مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے، لیکن مولانا بتاتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم گم ہوگئی۔ مولانا کا یہ نظریہ بالواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت اور دینِ اسلام کی حقانیت کے دوام وبقا کا انکار ہے۔

تیسرے، مولانا نے یہ نہیں سوچا کہ جس نظریہ کو وہ بڑے خوبصورت الفاظ میں پیش کر رہے ہیں دورِ قدیم کے ملاحدہ وباطنیہ سے لے کر دورِ جدید کے باطل پرستوں تک سب نے اِسی نظریہ کا سہارا لیا ہے اور اسی کے ذریعہ دین میں تحریف وتاویل کا راستہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے انکار کی تین صورتیں ہیں۔

اول: یہ کہ قرآنِ کریم کے الفاظ وآیات کے مُنزَّل من اللہ ہونے کا انکار کر دیا جائے۔

دوم: یہ کہ اسے مُنزَّل من اللہ تو مانا جائے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ اس کا مطلب نہیں سمجھے تھے، بلکہ ہم نے اِسے سمجھا ہے۔

سوم: یہ کہ قرآن کریم کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ اس کا جو مفہوم آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ نے سمجھا تھا وہ بعد کی صدیوں میں محفوظ نہیں رہا، اس لئے آج امت کے سامنے تفسیر وحدیث کی شکل میں قرآن کریم کا جو مفہوم محفوظ ہے اور جسے مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک پوری امت صحیح سمجھتی ہے، وہ (نعوذ باللہ) درست نہیں بلکہ قرآن کا اصل منشاء اور صحیح مفہوم وہ ہے جسے ہم پیش کر رہے ہیں۔

انکارِ قرآن کی پہلی دو صورتیں تو اتنی واضح کفر تھیں کہ کوئی بڑے سے بڑا زندیق بھی

اسلامی معاشرے میں اُن کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اِس لئے ملاحدہ کو یہ جرأت تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے مخفی کفر کا برملا اعلان کر دیں اور قرآنِ کریم کی آیات والفاظ کا صاف صاف انکار کر ڈالیں۔ اُن میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں تھی کہ قرآنِ کریم کا جو مفہوم تواتر کے ساتھ نسلاً بعد نسل، امت میں منقول چلا آتا ہے اُس کے بارے میں یہ تسلیم کر لیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ قرآن کے اِسی مفہوم کے قائل تھے اور اسی کو منشائے خدا سمجھتے تھے مگر ہم اس کے قائل نہیں۔ اگر ملاحدہ ان دونوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرتے تو اُن کے الحاد کی رَگ ہی کٹ جاتی اور ان کا کفر عریاں رقص کرنے لگتا، اس لئے وہ انکارِ قرآن کا تیسرا راستہ اختیار کرتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں قرآن کا صحیح مطلب محفوظ نہیں رہا اور نعوذ باللہ ''مولویوں'' نے قرآن کو نئے معنی پہنا دیئے۔ گویا جس طرح رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر چور خود گھر والے کا ہاتھ پکڑ کر ''چور چور'' کا شور مچا دیتا ہے، ناواقف لوگ اُس کی مرمت شروع کر دیتے ہیں اور چور وہاں سے کھسکنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اِسی طرح ان ملاحدہ نے اکابرِ اُمت پر قرآنِ کریم کے مفہوم کو بدلنے کا الزام دھر کر گزشتہ صدیوں کے ائمہ ہدیٰ کو پٹوا دیا، اور خود معصوم بن بیٹھے۔

مسٹر غلام احمد پرویز اور قادیانیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پرویز کا کہنا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں ''اللہ و رسول'' کی اطاعت کا ذکر آیا ہے اس سے مراد ہے کہ مرکزِ ملت کی اطاعت ''اللہ و رسول'' کا جو مطلب ملا سمجھتا ہے یہ عجمی ذہن کی پیداوار ہے۔ نعوذ باللہ۔

یا قادیانی کہتے ہیں کہ ''خاتم النبیین'' کے معنی ''مولوی صاحبان'' نے نہیں سمجھے۔ یہ آیت نبوت بند کرنے کے لئے نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر کے ساتھ جاری کرنے کے لئے ہے۔

یا یہ کہ قرآنِ کریم کی آیت ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفعِ جسمانی مراد نہیں بلکہ اس سے مراد ہے عزت کی موت۔ اور مولوی صاحبان جو معنی کرتے ہیں وہ بعد کی صدیوں میں بنا لئے گئے اور جب ان ملاحدہ کے سامنے آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ کی تصریحات پیش کی جائیں تو اُن کا جواب ہوتا ہے کہ یہ

سب بعد کے لوگوں کی تصنیف ہے۔ دراصل ان تمام ملاحدہ کو قرآن کریم کا انکار ہی مقصود ہے مگر صاف صاف انکار کی جرأت نہ پا کر وہ لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے یہ مسلّمہ معنی بعد کی صدیوں میں لوگوں نے بنائے ہیں۔ جب قرآنِ کریم کے متواتر معنی کا انکار کر دیا جائے تو نتیجہ وہی انکارِ قرآن ہے۔

بدقسمتی سے ٹھیک یہی راستہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مولانا مودودی نے اپنایا، وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ قرآن کے ان چار الفاظ کے جو معنی صدیوں سے مسلمان سمجھتے چلے آ رہے ہیں یہ عجمی ذہن کی پیداوار ہے، جن کو عربیت کا ذوق نہیں تھا اور اِن چار الفاظ کے اصل معنی گم ہو جانے کی وجہ سے پورا قرآن بے معنی ہو کر رہ گیا۔ مولانا کا یہ نظریہ سن کر مسٹر پرویز اور قادیانی صاحبان ضرور کہتے ہی ہوں گے:

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رُسوا شدیم

اور لطف یہ ہے کہ مولانا خود عجمی نژاد ہونے کے باوصف ذوقِ عربیت کی کمی کی تہمت اُن ائمہ عربیت پر لگا رہے ہیں جو لُغاتِ عرب کے حافظ ہی نہیں "دائرۃُ المعارف" تھے اور جو ایک ایک لفظ کے سینکڑوں معنی، ہر ایک کے محلِ استعمال اور بیسیوں شواہد کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ ان کے سامنے تاج العروس اور لسان العرب نہیں تھی، جس کی ورق گردانی کر کے وہ الفاظ کے معانی تلاش کرتے ہوں بلکہ اُن کا اپنا حافظہ بجائے خود تاج العروس و لسان العرب تھا۔ اِن اکابر کے بارے میں کس سادگی سے فرمایا جاتا ہے کہ قرآن کے فلاں فلاں الفاظ کا مفہوم اُن کی نظر سے اوجھل ہو گیا تھا اور قرآن اُن کے لئے ایک بے معنی کتاب بن کر رہ گیا تھا۔ **لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔**
بہر حال مولانا نے قرآنِ کریم کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے میں اُسے انکارِ قرآن ہی کی ایک صورت اور الحاد و زندقہ کی اصل بنیاد سمجھتا ہوں۔

(۹) قرآن کریم کے بعد حدیثِ نبویؐ اور سنتِ رسولؐ کا درجہ ہے (ﷺ) مولانا کے نظریات اِس کے بارے میں بھی ایسے مبہم اور لچک دار تھے جن کی بناء پر وہ حدیث و سنت کو آسانی سے

اپنی رائے میں ڈھال سکتے تھے، تفصیل کی گنجائش نہیں، یہاں مختصراً چند امور کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

اول: علمائے امت کے نزدیک حدیث اور سنت دونوں ہم معنی لفظ ہیں لیکن مسٹر غلام احمد پرویز اور ڈاکٹر فضل الرحمان وغیرہ سنت اور حدیث کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ مولانا مودودی صاحب کا نظریہ بھی یہی ہے کہ سنت اور حدیث دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ رہا یہ کہ ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے، اس کی پوری توضیح شائد مولانا خود بھی نہ کر سکیں۔ (دیکھئے رسائل ومسائل حصہ اول ص ۳۱۰)

دوم: مولانا کو ''فنافی الرسول'' اور ''مزاج شناسِ رسول'' ہونے کا دعویٰ ہے، اس لئے روایاتِ حدیث کے صحیح ہونے نہ ہونے کا فیصلہ بھی خود انہی پر منحصر ہے، وہ لکھتے ہیں:

''جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جسکی کیفیت بالکل ایسی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت، کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اُس کی نظر بہ حیثیت مجموعی شریعتِ حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اِس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اُس کے بعد جب جزئیات اُس کے سامنے آتے ہیں تو اُس کا ذوق اُسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی، روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی ردوقبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذات نبویؐ کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اُس کی بصیرت اُسے بتا دیتی ہے کہ اِن میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز

سنت نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اُس کو قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی اُن میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اُس کا فیصلہ یوں فرماتے یہ اس لئے کہ اُس کی فکر روحِ محمدیؐ میں گُم اور اُس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے، اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اُسی طرح دیکھتا ہے اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔"

اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لیتا ہے، اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند مقبول حدیث سے بھی "اعراض" کر جاتا ہے اس لئے کہ اِس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اُسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی"۔ (تفہیمات طبع چہارم ۱۹۴۷ء پٹھان کوٹ ص ر ۲۹۷)

سوم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو اہل علم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک قسم سننِ ہدیٰ کہلاتی ہے، جو امورِ دینیہ سے متعلق ہے اور جن کی پیروی امت کے لئے لازم ہے۔ دوسرا حصہ سننِ عادیہ کا ہے، یعنی وہ کام جو آپؐ نے کسی تشریحی حکم کے طور پر نہیں، بلکہ عام انسانی عادت کے تحت کئے۔ اُن کی پیروی اگرچہ لازم نہیں تاہم امورِ عادیہ میں بھی آپؐ کی پیروی جس حد تک ممکن ہو سرمایہ سعادت ہے، اور اگر ہم کسی امر میں آپؐ کی پیروی نہ کر سکیں، تو اُس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ لائق اقتداء نہیں بلکہ اُس کی وجہ ہماری استعداد کا نقص ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے محبوب و مطاع ہیں اور محبوب کی ایک ایک ادا محبوب ہوا کرتی ہے۔اِس لئے آپؐ کی اداؤں کو اپنے اعمال میں ڈھالنا تقاضائے محبت ہے اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سراپا خیر تھی،اللہ تعالیٰ نے ہر خیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں جمع کر دی تھی اور ہر شر اور برائی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاک رکھا تھا،اس لئے آپؐ کی سنت کی پیروی ہر خیر کے حصول اور ہر شر سے حفاظت کی ضمانت ہے۔امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

> ''چونکہ اصل سعادت یہی ہے کہ تمام حرکات وسکنات میں جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع کیا جائے اس لئے سمجھ لو کہ تمام افعال کی دو قسمیں ہیں، اول عبادات ،جیسے نماز،روزہ، حج،زکوٰۃ وغیرہ۔دوم عادات،مثلاً کھانا پینا،سونا،اٹھنا،بیٹھنا وغیرہ ،اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ دونوں قسم کے افعال میں آپؐ کی اقتداء کریں'' (تبلیغ دین ص ۳۹)

اُمورِ عادیہ میں اتباعِ سنت کی ضرورت کے شرعی و عقلی دلائل بیان کرنے کے بعد امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

> ''جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ امورِ عادیہ میں سنت کی ترغیب کے لئے بیان کیا ہے اور جن اعمال کو عبادات سے تعلق ہے اور اُن کا اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے اُن میں بلا عذر اتباع چھوڑ دینے کی تو سوائے کفرِ خفی کے یا حماقتِ جلی کے اور کوئی وجہ ہی سمجھ میں نہیں آتی۔'' (ص ۴۲)

اس کے برعکس مولانا مودودی نے معاشرتی و تمدنی اُمور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا مذاق نہایت بھونڈے الفاظ میں اڑایا ہے۔مولانا لکھتے ہیں کہ اکثر دیندار غلطی سے اتباعِ رسولؐ اور سلفِ صالح کی پیروی کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ:

> ''جیسا لباس وہ پہنتے تھے ویسا ہی ہم پہنیں،جس قسم کے کھانے وہ کھاتے تھے اُسی قسم کے کھانے ہم بھی کھائیں،جیسا طرز معاشرت اُن کے گھروں میں تھا بعینہٖ وہ ہی طرزِ معاشرت ہمارے گھروں میں بھی ہو۔''

مولانا کے نزدیک اتباعِ سنت کا یہ مفہوم صحیح نہیں بلکہ:

''اتباع کا یہ تصور، جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے [1] دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے، درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم ''جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ'' بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو ''قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ'' بنائے رکھیں۔'' (تنقیحات ص۲۱۰۔۲۰۹ پانچواں ایڈیشن)

بلاشبہ جدید تمدن نے جو سہولتیں بہم پہنچائی ہیں اُن سے استفادہ گناہ نہیں اور حدِ جواز کے اندر رہتے ہوئے آپ تمدن و معاشرت کے نئے طریقوں کو ضرور اپنا سکتے ہیں، لیکن آنحضرت ﷺ کے لباس، آپ کی وضع قطع اور آپؐ کی طرزِ معاشرت کو ''آثارِ قدیمہ'' اور ''قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ'' جیسے مکروہ الفاظ سے یاد کرنا نہ صرف آئینِ محبت کے خلاف ہے بلکہ تقاضائے ایمان و شرافت سے بھی بعید ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جس شخص کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذرا بھی عظمت ہو وہ آپؐ کی وضع قطع اور آپؐ کے طرزِ معاشرت کی اس طرح پھبتی اڑا سکتا ہے۔

''مولانا مودودی کا یہ فلسفہ بھی انوکھا ہے کہ:

''اسلام ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں اُن سب میں ہم یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ (تنقیحات ص۱۰)

گویا مولانا کے نزدیک اسلامی قالب کی پابندی ضروری نہیں، ہر چیز کا قالب وہ خود تیار کیا کریں گے، البتہ اُس میں ''اِسلامی روح'' بھر کر اسے مشرف بہ اسلام کریں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ مولانا کے ہاں وہ کونسی فیکٹری ہے جس میں ''اسلامی روح'' تیار ہوتی ہے اور جس کی ایک چٹکی کسی قالب میں ڈال دینے سے وہ قالب اسلامی بن جاتا ہے؟ اِس منطق سے مولانا نے سینما کی بھی دو قسمیں کر ڈالی ہیں، اسلامی اور غیر اسلامی۔ سینما کے قالب میں اگر اسلامی

---

[1] اس فقرے میں وہی ملحدانہ نظریہ کارفرما ہے کہ بعد کی صدیوں میں اتباعِ سنت کا ''اصل مفہوم'' محفوظ نہیں رہا۔

روح پھونک دی جائے تو وہ ''اسلامی سنیما'' بن جاتا ہے۔ یہ ہے مولانا مودودی کا فہمِ اسلام اور سنتِ نبویؐ کی اُن کی نظر میں قدر و قیمت۔

چہارم: میں ''سنت و بدعت'' کی بحث میں عرض کر چکا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کے طریقہ کا نام ''سنت'' ہے اور آپؐ کے طریقہ کے خلاف کو ''بدعت'' کہا جاتا ہے مگر مولانا مودودی چونکہ صرف ''اسلامی روح'' کے قائل ہیں، اِس لئے اُن کے نزدیک ''اسلامی قالب'' پر بھی بدعت کا اطلاق ہوتا ہے۔ گویا اُن کے فلسفہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سنتِ دائمہ'' بدعت بن جاتی ہے، مولانا لکھتے ہیں:

> ''میں اُسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات کے اُن مفہومات کو غلط بلکہ دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں جو بالعموم آپ حضرات کے ہاں رائج ہیں[1] کیا آپ عقلِ کُل بن گئے ہیں؟ آپ کا یہ خیال کہ نبی ﷺ جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے اتنی ہی بڑی ڈاڑھی رکھنا سنتِ رسول یا اُسوۂ کامل ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عاداتِ رسول کو وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث کئے جاتے رہے ہیں مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر اُن کے اتباع پر زور دینا ایک سخت قسم کی ''بدعت'' ایک خطرناک تحریفِ دین ہے، جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے''۔ (رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۰۷، ص ۲۰۸ تیسرا ایڈیشن ۵۷ء)

یہاں مولانا کو دو غلط فہمیاں ہوئی ہیں، ایک یہ کہ انہوں نے ڈاڑھی رکھنے کو ''عاداتِ رسول'' کہہ کر اُس کے سنت ہونے سے انکار کیا ہے حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

[1] یہاں وہی ملحدانہ نظر سے کارفرما ہے کہ لوگوں نے اصطلاحات شرعیہ کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔

اُس کو فطرت اور انبیاء کرام کی متفق علیہ سنت فرمایا ہے، امت کو اُس کی اِقتداء کا صاف صاف حکم فرمایا ہے اور اُس کی علت بھی ذکر فرمادی ہے یعنی کفار کی مخالفت، اس لئے اس کو سننِ عادیہ میں شمار کرنا اور اِس کے سنت کہنے کو دین کی تحریف تک کہہ ڈالنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بیہودہ جسارت ہے۔ فقہائے امت نے منشائے نبوی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اُسے سننِ واجبہ میں شمار کیا ہے۔

دوسری غلط فہمی مولانا مودودی کو یہ ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی علیہ وسلم نے ڈاڑھی کے بڑھانے کا حکم تو ضرور دیا ہے۔ مگر اُس کی کوئی مقدار مقرر نہیں فرمائی، اس لئے بقول ان کے ڈاڑھی کی کوئی خاص مقدار سنت نہیں حالانکہ یہ بات از خود غلط ہے، اِس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے ڈاڑھی کے بڑھانے کا حکم دیا ہے، اُس کے کاٹنے کا، کہیں حکم نہیں فرمایا نہ اُس کی اجازت دی ہے، اِس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ اس کا کاٹنا کسی حد پر بھی جائز نہ ہوتا۔ مگر بعض صحابہؓ کے اس عمل سے کہ وہ ایک قبضہ سے زائد بال کٹوا دیا کرتے تھے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کم از کم حد یہ مقرر فرمائی تھی، اگر اس سے کم بھی جائز ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ضرور اجازت دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے امت میں سے کسی نے بھی ایک مشت سے کم ڈاڑھی رکھنے کو جائز نہیں رکھا۔ شیخ ابن ھمامؒ شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں:

وَاَمَّا الْاَخْذُ مِنْهَا وَهِيَ دُوْنَ ذٰلِكَ كَمَا يَفْعَلُهٗ بَعْضُ الْمُغَارِبَةِ وَمُخَنَّثَةُ الرِّجَالِ فَلَمْ يُبِحْهُ اَحَدٌ (فتح القدیر ص ۲۷۰ ج ۲)

ترجمہ: لیکن ایک مشت سے کم ڈاڑھی کے بال کاٹنا، جیسا کہ مغرب کے بعض لوگوں اور عورت نما مردوں کا معمول ہے، اس کی کسی نے اجازت نہیں دی۔

صد حیف! کہ ایسی سنتِ متواترہ کو مولانا مودودی محض خود رائی سے نہ صرف مسترد کر دیتے ہیں، بلکہ اُلٹا اُسے ''تحریف دین'' تک کہہ ڈالتے ہیں اور ''ڈاڑھی کا طول کتنا ہے'' کے طنزیہ فقرے سے اس کا مذاق اُڑاتے ہیں (رسائل و مسائل ص ۱۸۷ ج ۱)

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے مقابلہ میں اتنا جری ہو کیا وہ عالمِ دین کہلانے مستحق ہے؟

پنجم: میں اِس سے پہلے عرض کر چکا ہوں حضرات خلفائے راشدینؓ کی سنت بھی سنتِ نبوی ﷺ کا ایک حصہ ہے اور یہ بھی امت کے لئے واجب الاتباع ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں ایک اہم ترین نکتہ عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اجماعِ امت کی اصل بنیاد خلفائے راشدینؓ کے فیصلے ہیں۔ کتاب وسنت کے منصوص احکام کے علاوہ جن مسائل پر امت کا اجماع ہوا ہے ان کا بیشتر حصہ وہ ہے جن کے بارے میں خلفائے راشدینؓ نے فیصلہ کیا اور فقہائے صحابہؓ نے اُن سے اتفاق کیا، اِس طرح صدرِ اول ہی میں اُمت اِس پر متفق ہوگئی۔

خلفائے راشدینؓ کے بعد شاذ و نادر ہی کسی کے مسئلہ پر امت کا اجماع ہوا ہے،

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

''معنی اجماع کہ بر زبانِ علماء شنیدہ باشی ایں نیست کہ ہمہ مجتہدان لایشذ فرد در عصرِ واحد بر مسئلہ اتفاق کنند، زیرا کہ ایں صورتے است غیر واقع، بل غیر ممکنِ عادی، بلکہ معنیِ اجماع حکمِ خلیفہ است بچیزے بعد مشاورۂ ذوی الرائے یا بغیر آں، ونفاذِ آں حکم تا آنکہ شائع شد و در عالم ممکن گشت'' قَالَ النَّبِیُّ ﷺ عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ''

(ازالۃ الخفاء ص ۲۶ ج ۱)

ترجمہ: اور اجماع کا لفظ جو تم نے علماء کی زبان سے سنا ہوگا اِس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک زمانے کے سارے مجتہد، بایں طور کہ ایک فرد بھی باہر نہ رہے، کسی مسئلہ پر اتفاق کرلیں، کیونکہ یہ صورت نہ صرف یہ کہ واقع نہیں بلکہ عادۃً ممکن بھی نہیں، بلکہ اجماع کے معنی یہ ہیں کہ خلیفہ ذورائے لوگوں سے مشورہ کر کے یا بغیر مشورے کے کسی چیز کا حکم کرے اور وہ حکم نافذ ہو جائے، یہاں تک کہ وہ شائع ہو جائے اور دنیا میں اس کے پاؤں جم جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لازم پکڑو میری سنت کو اور میرے بعد میرے خلفائے راشدینؓ کی سنت کو۔

مگر ارشادِ نبویؐ کے برعکس مولانا مودودی کی رائے یہ ہے کہ ''خلفائے راشدینؓ کے فیصلے بھی اسلام میں قانون قرار نہیں پائے جو انہوں نے قاضی کی حیثیت سے کئے تھے''۔ (ترجمان القرآن جنوری ۵۸ء)

قرآن کریم، سنتِ نبوی، خلفائے راشدین کی سنت (جو اجماعِ امت کی اصل بنیاد ہے) کے بارے میں مولانا مودودی کے ان نظریات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اصولِ دین اور شریعتِ اسلامیہ کے مآخذ کے بارے میں اُن کا ذہن کس قدر اُلجھا ہوا ہے۔ باقی رہا اجتہاد! تو مولانا اپنے سوا کسی کے اجتہاد کو لائق اعتماد نہیں جانتے، اِس لئے اُن کی دین فہمی کا سارا مدار خود اُن کی عقل و فہم اور صلاحیتِ اجتہاد پر ہے۔

اِن چند نکات سے مولانا مودودی کے دینی تفکر اور اُن کے زاویہ نظر کو سمجھا جا سکتا ہے، ورنہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اُن غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں کی فہرست طویل ہے۔ میرے نزدیک مولانا مودودی کا شمار اُن اہل حق میں نہیں جو سلف صالحین کا تتبع اور مسلکِ اہلِ سنت کی پیروی کرتے ہیں، بلکہ اُنہوں نے اپنی عقل و فہم سے دین کا جو تصور قائم کیا وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں، خواہ وہ سلفِ صالحین سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، مولانا کے دینی تفکر میں نقص کے بڑے بڑے اسباب میرے نزدیک حسب ذیل ہیں:

اول: اُنہوں نے دین کو کسی سے پڑھا اور سیکھا نہیں بلکہ اُسے بطور خود سمجھا ہے اور شائد مولانا کے نزدیک دین کسی سے سیکھنے اور پڑھنے کی چیز بھی نہیں بلکہ اُن کے خیال میں ہر لکھا پڑھا آدمی اپنے ذاتی مطالعہ سے خود ہی دین سیکھ سکتا ہے۔

دوم: ناپختہ عمری میں مولانا کو بعض ملاحدہ سے صحبت رہی جس نے اُن کی شخصیت کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کیا، خود مولانا اپنی کہانی اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ڈیڑھ سال کے تجربات نے یہ سبق دیا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونا ضروری ہے اور استقلال کے لئے جدوجہد کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ فطرت نے تحریر و انشاء کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا عام مطالعے سے اُس کو اور تحریک ہوئی۔ اُس زمانہ میں جناب نیاز فتحپوری سے دوستانہ

تعلقات ہوئے اور اُن کی صحبت بھی وجہ تحریک بنی ، غرض ان تمام وجوہ سے یہ فیصلہ کیا کہ قلم ہی کو وسیلۂ معاش قرار دینا چاہئے (مولانا مودودی ص ۲۷، اسعد گیلانی)

سوم: دنیا کی ذہین ترین شخصیتوں کو عموماً یہ حادثہ پیش آیا ہے کہ اگر اُن کی صحیح تہذیب و تربیت نہ ہو پائے تو وہ اپنا راستہ خود تلاش کرتی ہیں اور اپنے آپ کو اتنی قد آور اور بلند و بالا سمجھنے لگتی ہیں کہ باقی سب دنیا اُنہیں پستہ قد نظر آتی ہے۔ یہی حادثہ مولانا مودودی کو بھی پیش آیا۔ حق تعالیٰ نے اُن کو بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا، لیکن بدقسمتی سے اُنہوں نے دل کا کام بھی دماغ سے لیا۔ اور خوش فہمی کی اتنی بلندی پر پہنچ گئے کہ تمام اکابر امت اُنہیں بالشتیے نظر آنے لگے۔ اور اُنہوں نے یہ محسوس کیا کہ دین کا جو فہم اُن کو عطا ہوا ہے وہ اُن سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوا تھا۔ یہی خوش فہمی اُن کی خودرائی اور اعجاب بالنفس کا ذریعہ بن گئی۔

چہارم: اُن کے ذہن پر دورِ جدید کا کچھ ایسا رعب چھایا کہ اُنہیں دین اسلام کو اُس کی اصل شکل میں پیش کرنا مشکل نظر آیا۔ اس لئے اُنہوں نے اِس کی اصلاح و ترمیم کر کے دورِ جدید کے اذہان کو مطمئن کرنا ضروری سمجھا، خواہ اسلام کی ہیئت ہی کیوں نہ بدل جائے، جیسا کہ آج ''جمہوریت'' دنیا کے دماغ پر ایسی چھائی ہوئی ہے کہ لوگ کوشش کر کے اسلام کے نظامِ حکومت کو جمہوریت پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پنجم: ان تمام امور کے ساتھ جب ان کے زورِ قلم اور شوخیٔ تحریر کی آمیزش ہوئی تو اُس نے اُنہیں اکابر امت کے حق میں حدِ ادب عبور کرنے پر آمادہ کیا، اور اِس بے ادبی کی نحوست اُن کی ساری تحریر پر غالب آ گئی۔

کاش! مولانا مودودی جیسے ذہین و فطین آدمی کی صحیح تربیت ہوئی ہوتی تو اُن کا وجود امت کے لئے باعثِ برکت اور اسلام کے لئے لائقِ فخر ہوتا۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعان را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

ملنے کے پتے:

مدرسہ مُعاذ بن جبل

وادیِ اسمٰعیل، علی گڑھ

الفرقان بکڈپو

114/31 نظیر آباد، لکھنؤ

DESIGNED AT : S. F. GRAPHIX

PRINTED AT : KAKORI OFFSET PRESS, LKO. PH. : 2629616